ISBN-978-93-82288-26-8

شوقی اور اقبال

ڈاکٹر محمد سلطان شاہ اصلاحی

اقبال انسٹی ٹیوٹ آف کلچر اینڈ فلاسفی، یونیورسٹی آف کشمیر

اقبالیات

NCPUL
28/2/2020

ISBN-978-93-82288-26-8

58366
153/153
20930

شوقی اور اقبال

COMPLIMENTRY BOOK
NCPUL, NEW DELHI

ڈاکٹر محمد سلطان شاہ اصلاحی

اقبال انسٹی ٹیوٹ آف کلچر اینڈ فلاسفی یونیورسٹی آف کشمیر

ISBN-978-93-82288-26-8

(جملہ حقوق بحق اقبال انسٹی ٹیوٹ آف کلچر اینڈ فلاسفی یونیورسٹی آف کشمیر محفوظ ہیں)

کتاب کا نام	....	شوقی اور اقبال
سنہ اشاعت	....	۲۰۱۷ء
ناشر	....	ڈائریکٹر اقبال انسٹی ٹیوٹ آف کلچر اینڈ فلاسفی
مطبع	....	کاف پرنٹرس، حبہ کدل سری نگر
تعداد اشاعت	....	ایک ہزار
کمپوٹر کمپوزنگ	....	عُرفی جان اقبال انسٹی ٹیوٹ آف کلچر اینڈ فلاسفی
قیمت	....	پانچ سو روپے

ملنے کا پتہ

اقبال انسٹی ٹیوٹ آف کلچر اینڈ فلاسفی کشمیر یونیورسٹی حضرت بل سری نگر ۱۹۰۰۰۶

ای میل:۔ iqbalinstituteku@yahoo.in

58366
153 | 153
20930

ترتیب

تقریظ — صفحہ نمبر

پیش لفظ:		i-x
باب اوّل :	شوقی اور اقبال (مشاہیر کی نظر میں)	1-12
باب دوم :	عالم اسلام استعماریت کی زد میں	13-26
باب سوم :	نوید صبح	27-69
باب چہارم:	چند وہبی مماثلتیں	70-77
باب پنجم :	شوقی اور اقبال کا قرآنی شعور	78-89
باب ششم:	شوقی اور اقبال کی نعتیہ شاعری	90-117
باب ہفتم :	شوقی اور اقبال کا تصور خلافت	118-145
باب ہشتم :	شوقی اور اقبال کی اندلسیات	146-189
باب نہم :	خلاصۂ بحث	190-195
کتابیات:		196-205

پیش لفظ

مجھے اپنی اوائل عمر سے ہی علامہ محمد اقبال کی شاعری سے اُنس تھا۔ اس لئے کہ گھر اور پرائمری اسکول میں موصوف کی وہ سبق آموز نظمیں جوانہوں نے اطفال کے لئے لکھی ہیں ہم سُنا کرتے یا دوسروں کو خاص مواقع پر سنایا کرتے تھے۔ خاص طور پر وہ دُعا جو ہم روازنہ اسکول میں صبح سویرے، ترنم سے، اللہ کی بارگاہ میں ہاتھ پھیلا کر، ذوق وشوق سے مانگا کرتے تھے:

لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری
زندگی شمع کی صورت ہو خدایا میری

مجھے ہائر اسکنڈری اسکول اور کالج کی طالب علمی کے دوران بعض ایسے اساتذہ ملے جو بلند پایہ ادبی ذوق رکھتے تھے اور اردو، وفارسی شاعری کے شیدائی تھے۔ انہوں نے میرے ادبی ذوق کو اور جلا بخشی۔ اس دوران میں نے کلام اقبال اور ان پر لکھی ہوئی بعض اہم کتابوں کا مطالعہ بھی کیا۔ البتہ علامہ کے فارسی کلام کا ان کے شارحین ہی کی کتابوں سے استفادہ کیا۔ اس سے فارسی زبان وادب کی طرف میری تشنگی میں اور اضافہ ہوا۔

کالج کے بعد ناچیز کو ادبِ عربی اور حصولِ علومِ دینیۃ کے لئے دارالعلوم ندوۃ العلماء (لکھنو) بھیجا گیا۔ یہاں کے علمی اور ادبی ماحول میں مجھے بعض ایسے احباب کی رفاقت نصیب ہوئی جو فارسی زبان وادب سے بخوبی آشنا تھے۔ ان سے میں نے فارسی زبان بدرس پڑھی۔ ندوۃ العلماء میں کلامِ اقبال کو قدر کی نظروں سے دیکھا جاتا ہے۔ ندوۃ کے علماء و

فضلاء نے علامہ کے کلام پر یادگار کتابیں لکھی ہیں۔ سید سلیمان ندوی اور اقبال کے باہمی روابط و تعلقات سے اہل علم آگاہ ہیں۔ عبدالسلام ندوی کی ''اقبالِ کامل'' اقبالیات پر ایک منفرد کتاب ہے۔ عرب دنیا کو اقبال سے روشناس کرانے کیلئے مولانا مسعود عالم ندووی نے قاہرہ سے نکلنے والے رسالہ ''الفتح'' میں ان کی وفات کے بعد ایک گرانقدر اور موثر مضمون لکھا۔ اسی دوران سید ابوالحسن علی ندویؒ نے علامہؒ پر عربی میں بیش بہا مقالات لکھے جیسے ''شاعر الاسلام الدکتور محمد اقبال'' یہ مقالہ بعد میں (۱۹۵۱ء) سعودی ریڈیو نے نشر ہوا۔ دوسرا مقالہ ''العَوامِلُ التی کُونَتْ شَخصِیَۃَ محمد اقبال'' ۲۸/مارچ ۱۹۵۱ء کو قاہرہ کے مشہور تعلیمی مرکز اور دانشگاہ ''دارالعلوم'' میں پڑھا گیا۔ اسی مقالہ کے دوسرے حصے کا عنوان ہے ''نَظرۃُ محمد اقبال الی نِظامِ التعلیم العصری و مراکزہ''۔ تیسرا مقالہ ''الاِنسانُ الکامِل فی نَظرِ محمد اقبال'' ۱۰/اپریل ۱۹۵۱ء کو قاہرہ یونیورسٹی کے ہال میں طلبہ اور اساتذہ کے سامنے پڑھا گیا۔ پھر ۱۹۵۶ء میں جناب سیّد صاحب کی ایک مشہور تقریر دمشق ریڈیو اسٹیشن سے نشر ہوئی جس کا عنوان ہے ''اِقبال فی مدینۃِ الرّسول''۔ یہ تمام مقالات مع تفصیل سیّد صاحب کی مشہور کتاب ''رَوائعُ اقبال'' میں شائع ہو چکے ہیں۔ اس کتاب کی عرب دنیا میں خاص طور پر اور عجمی دنیا میں عام طور پر خوب پزیرائی ہوئی۔

ندوۃ العلماء میں میری طالب علمی کے زمانے میں سیّد ابوالحسن علی ندوی اس کے ناظمِ اعلیٰ تھے۔ مجھے اپنے ظرف کے مطابق، ندوۃ میں اور موصوف کے گھر میں ان کی صحبت سے فیضیاب ہونے کی سعادت حاصل ہوئی ہے۔ اس ماحول میں میرے فرصت کے لمحات کلامِ اقبال، ان کی نثری کاوشوں یا اُن سے متعلق مختلف کتب و جرائد کی غواصی میں گزر جاتے۔ لیکن میں نے ایم۔ اے۔ کے لئے عربی زبان و ادب ہی کو اختیار کیا۔ پھر ایم فل اور پی

ایچ۔ڈی بھی اسی میں کیا۔ پی ایچ۔ڈی میں میرا موضوعِ بحث ''الإتجاهات الإسلامية في شعر شوقي ''تھا۔امیر الشعراء احمد شوقی کی حیات، شاعری اور فکر وفن کے مطالعہ کے دوران میں نے یہ محسوس کیا کہ شوقی اور اقبال کے درمیان بہت ساری مماثلتیں پائی جاتی ہیں۔ میرے دل میں یہ شوق بار بار انگڑائیاں لینے لگا کہ کیوں نہ اس موضوع پر کام کیا جائے۔

دونوں عبقری شاعر دو مختلف براعظموں میں رہنے کے باوجود، ایک ایسی ملّت کے روشن چراغ ہیں جسے اللہ تعالیٰ نے اپنی آخری کتاب۔ القرآن الکریم۔ میں ''خیر امت'' کے لقب سے نوازا ہے۔ یہ ملّت قومیت، وطنیت اور لسانی تعصب کی تنگ نظری کے جھمیلوں سے بہت دور، ساری انسانیت کو ایک خاندان کی حیثیت سے دیکھتی ہے۔ یہ امّت اس ازلی اور ابدی پیام کی حامل ہے جو اس کو رب جلیل نے ''القرآن الکریم'' کی صورت مین دیا ہے۔اس نسخۂ کیمیا کے لانے والے اللہ کے آخری رسول حضرت محمد ﷺ ہیں جو تمام انسانیت کی طرف سراپا رحمت بنا کر بھیجے گئے ہیں۔ ہمارے زیر بحث دونوں شاعروں پر قرآن اور صاحب قرانﷺ کے انوار کا پرتو ہے۔ اس لئے ان دونوں کی شاعری بھی آفاقی اقدار (Universal values) کی حامل ہے۔اہلِ نظر کو چاہئے کہ وہ فراخ دلی سے ان کے کلام کا مطالعہ کریں اور ان آفاقی اقدار کے سامنے اپنا سر تسلیم خم کریں۔

دونوں عبقری شاعروں کا مطالعہ ومشاہدہ بہت وسیع ہے۔ جو کچھ انہوں نے اپنے ادبی شہہ پاروں میں ارشاد فرمایا ہے وہ اس سے بہت کم ہے جو وہ جانتے تھے۔اس کا اندازہ ہر وہ باحث بخوبی کر سکتا ہے جو ایک صفحہ لکھنے کے لئے بہت ساری عمدہ کتابوں کا بغائر مطالعہ کرتا ہے۔ پھر جو کچھ وہ جانتا ہے، اس کا بہت ہی قلیل حصہ رقم کرتا ہے یا کر پاتا ہے۔

بہر حال دونوں نابغۂ عصر شاعروں کے درمیان کچھ تفاوتوں کے باوجود بہت ساری

مماثلتیں بھی ہیں ۔ جنہیں اجاگر کرنے اور منظر عام پر لانے کی از حد ضرورت ہے۔ راقم سطور نے اسی جذبے کے ماتحت اس موضوع پر کام کرنے کے لئے، کشمیر یونیورسٹی کے ’اقبال انسٹی ٹیوٹ آف کلچر اینڈ فلاسفی‘ کی سابقہ ڈائریکٹر پروفیسر تسکینہ فاضل صاحبہ سے گزراش کی۔ انہوں نے بصد شوق مجھے اس موضوع پر، اپنے شعبہ میں کام کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی جس کے لئے میں دل کی عمیق گہرائیوں سے ان کا مشکور ہوں۔

شوقی اور اقبال کی مماثلتوں کا یہ موضوع نہایت مہتم بالشان اور متنوع ہے۔ اس قدر وسیع کہ ہر باب ایک مفصل کتاب کا تقاضا کرتا ہے۔ میں نے طوالت سے احتراز کرتے ہوئے اطناب کے بجائے ایجاز کی راہ اختیار کی۔ موضوع بحث کو نو ابواب میں تقسیم کیا۔

باب اوّل میں شوقی اور اقبال کو مشاہیر کی نظر میں پیش کیا ہے تا کہ دونوں نابغین کا اجمالی مگر جامع تعارف ہو جائے۔

باب دوم میں عالمِ اسلام کے اس المیہ کا جائزہ لیا گیا ہے کہ اس کا شیرازہ کس طرح بکھر گیا اور یورپی استعماریوں نے اسے کس طرح اپنا تر نوالہ بنالیا۔ پہلے قومیت کا جام پلا کر انہیں باہم لڑوایا۔ پھر اقلیمیت کے جال میں پھنسا کر انہیں تقسیم در تقسیم کیا۔ (مصر و ہندوستان بھی اسی جال میں پھنس گئے)۔ پھر ان پر حکومت کی۔ اس باب کا نام ”عالمِ اسلام استعماریت کی زد میں“ رکھ دیا۔

باب سوم کا نام ”نوید صبح“ رکھا۔ وہ اسلئے کہ اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں جبکہ سارے عالمِ اسلام کا شیرازہ بکھر چکا تھا اور اغیار اس پر حکومت کر رہے تھے۔ اس محکومیت اور مظلومیت کے روح فرسا دور میں بعض مسلم دانشوروں سے یہ بے کسی اور بے بسی دیکھی نہ گئی۔ وہ بے قرار ہوئے اور انہوں نے مغربی استعماریوں سے چھٹکارا حاصل کرنے کی حکمتِ عملی پر

غور وخوض شروع کیا۔

باب چہارم چونکہ شوقی اور اقبال اسی دور میں پیدا ہوئے۔ اسی ماحول میں پرورش پائی۔ اگرچہ دونوں شاعر، ایک دوسرے سے بہت دور دو براعظموں میں رہتے تھے۔ اس کے باوجود ان کے درمیان بعض وہبی مماثلتیں پائی جاتی ہیں۔ مثلاً پیدائش، ابتدائی تعلیم، اساتذہ، پھر یورپ میں تعلیم وغیرہ۔ اس باب میں ان ہی وہبی مماثلتوں کو اجاگر کیا گیا ہے۔

باب پنجم میں شوقی اور اقبال کی قرآن کریم سے جو خاص وابستگی اور وارفتگی رہی ہے، اسی پہلو کو سامنے لایا گیا ہے۔ دونوں نے اس کتاب زندگی سے کیا اخذ کیا اور ہمیں کیا دیا اس پہلو سے بھی اختصار کے ساتھ بحث کی گئی ہے۔

باب ششم میں نعتیہ شاعری کا اجمالی تعارف کرنے کے بعد دونوں محبانِ رسول ﷺ شاعروں کی نعتیہ شاعری کا تجزیہ بھی کیا گیا ہے۔ دونوں خوش بخت شاعروں کے درمیان یہاں بھی بڑی مماثلت پائی جاتی ہے مثلاً دونوں نے فریاد بھی کی ہے، امت کی خستہ حالی کا رونا بھی رویا ہے اور مسلمانوں کو ان کی بے عملی پر کوسا بھی ہے۔

باب ہفتم میں پہلے خلافت کا تعارف کیا گیا ہے۔ اس کے بعد اس بات کو سامنے لایا گیا ہے کہ شوقی اور اقبال کس طرح اسلام کے پیش کردہ نظامِ خلافت کو انسانیت کے لئے داروئے حیات سمجھتے ہیں۔ اس باب کا عنوان شوقی اور اقبال کا تصور خلافت رکھا ہے۔

باب ہشتم میں مسلمانوں کے فردوسِ گم شدہ۔ اندلس۔ کا اختصار سے تاریخی جائزہ لیا گیا ہے کہ مسلمان کب وہاں آئے آٹھ سو سال تک حکومت کرنے کے بعد وہاں سے کیوں بے آبرو ہو کر نکلے یا نکالے گئے۔ چونکہ دونوں شاعر اندلس گئے ہیں اور وہاں کے اسلامی آثار دیکھ کر بہت روئے ہیں اور اس پر نظمیں لکھی ہیں جو اندلسیات کا ایک منفرد دبستانِ شعر

ہے۔ اس باب میں عربی اور اردو کے اسی دبستانِ شعر کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس باب کا نام شوقی اور اقبال کی اندلسیات رکھا ہے۔

باب نہم خلاصہ بحث پر مشتمل ہے۔ اس میں اس بات کو پیش کیا گیا ہے کہ دونوں شاعر وحدتِ ملت کے پرزور داعی ہیں۔ وہ اس کے لئے قرآن اور صاحب قرآن ﷺ کے ساتھ عملی ربط و تعلق، اسی کے مطابق بہتر کردار، قیامِ خلافت اور عالم اسلام کے لئے ایک مضبوط مرکز کو ضروری سمجھتے ہیں۔ اس کے ساتھ وہ اسلامی ثقافت کے پرزور نقیب ہیں۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہماری اس حقیر کوشش کو شرفِ قبولیت سے نوازے اور ہماری کوتاہیوں سے درگزر فرمادے۔ (آمین)

ڈاکٹر محمد سلطان شاہ اصلاحی

سابق ریسرچ فیلو

اقبال انسٹی ٹیوٹ آف کلچر اینڈ فلاسفی یونیورسٹی آف کشمیر

اظہار تشکر

میں اس کام کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لئے ماہر اقبالیات اور اقبال انسٹی آف کلچر اینڈ فلاسفی کے ڈائریکٹر پروفیسر بشیر احمد نحوی صاحب کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں کہ انہوں نے اپنی تمامتر مصروفیات کے باوجود مجھے وقت وقت پر اپنی شفقتوں سے نوازا۔

جناب پروفیسر مرغوب بانہالی صاحب کی پدرانہ شفقتوں اور محبتوں کلا شکریہ ادا کرنے کے لئے الفاظ میرا ساتھ نہیں دیتے۔ ان کا اسمِ گرامی کسی تعارف کا محتاج نہیں۔

میں اپنے بھائی ڈاکٹر مشتاق احمد گنائی صاحب کا انتہائی شکر گزار ہوں کہ یونیورسٹی میں ان ہی کے کمرے میں بیٹھ کر میں نے اس کتاب کا بیشتر حصّہ ترتیب دیا اور ان کی ذاتی کتابوں سے میں نے استفادہ بھی کیا۔

میں اسی مقدس شعبہ کی لائبریرین اور دیگر تمام ملازمین کا بہت شکر گذار ہوں کہ انہوں نے میری معاونت میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔

خاص طور پر بیٹی عرفی جان، کمپیوٹر کمپوزر اقبال انسٹی ٹیوٹ کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے اس کتاب کو کمپوز کرنے میں بڑی دلچسپی کا مظاہرہ کیا۔ اللہ تعالیٰ اس کو ہمیشہ کامیابی سے نوازے۔

اگر میں جسٹس نذیر احمد کاوسہ صاحب کا شکریہ ادا نہ کروں تو یہ بڑی بے ادبی ہوگی کہ موصوف علامہ محمد اقبال کے عاشقِ زار ہیں۔ علم دوست ہونے کے علاوہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ایک فیض یافتہ چراغ ہیں۔ انہوں نے ہمیں بعض نادر کتابوں سے نوازا اور ہر بار پوچھتے رہتے کہ آپ کا پروجیکٹ کہاں پہنچا۔

بہر حال اللہ ہی کا فضل و کرم ہے جس کی بے پناہ عنایتوں سے یہ کام پایہ تکمیل کو پہنچا۔ اسی کی بارگاہ میں دعا ہے کہ وہ اس حقیر کاوش کو شرفِ قبولیت سے نوازے۔

ڈاکٹر محمد سلطان شاہ، اصلاحی

حرفِ چند

عربی زبان کے امیر اشعراء احمد شوقی اور اُردو وفارسی زبان کے شاعر حکیم الامت علامہ محمد اقبال ہم عصر شعراء ہیں۔ احمد شوقی ۱۸۶۹ء میں قاہرہ (مصر) میں پیدا ہوئے اور ۱۹۳۲ء میں وفات پائی جبکہ علامہ اقبال کی ولادت ۱۸۷۷ء میں سیالکوٹ (پاکستان) میں ہوئی اور ۱۹۳۸ء میں اس دار فانی کو الوداع کہا۔ اس طرح شوقی علامہ اقبال سے ۲۸ سال پہلے پیدا ہوئے اور ۸ سال پہلے چل بسے۔ دونوں نابغۂ روزگار دو الگ الگ براعظموں میں رہتے تھے اور دونوں کی ملاقات بھی ثابت نہیں۔ تاہم دونوں عبقری شخصیتوں کے درمیان بعض فطری مماثلتیں پائی جاتی ہیں اور دونوں کے یہاں کئی عناصر قدر مشترک کی حیثیت رکھتے ہیں۔ پہلا فکری اشتراک یہ ہے کہ دونوں کے فکر کا سرچشمہ یا منبع قرآن حکیم ہے اور دونوں آقائے نامدار حضرت محمد ﷺ کی ذات اقدس کے تئیں والہانہ عقیدت ومحبت رکھتے ہیں۔

ناقدانِ علم وادب نے احمد شوقی کو متنبی کے بعد عربی زبان کا سب سے بڑا شاعر قرار دیا ہے۔ انہوں نے اقبال کی طرح پہلے اپنے ملک مصر میں تعلیم حاصل کی۔ پھر فرانس میں چار سال ۱۸۸۷ء سے ۱۸۹۱ء تک قانون کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ یہاں چھٹیوں میں شوقی کو انگلستان جانے کا موقع بھی ملا۔

چونکہ شوقی عربی اور ترکی کے علاوہ فرانسیسی زبان سے بخوبی آگاہ تھے۔ تھوڑی انگریزی بھی جانتے تھے۔ اسلئے انہوں نے یورپی ادب کا غائر مطالعہ کیا۔ یورپ کی علمی اور ادبی مجلسوں میں شرکت کی اور یہاں کی تہذیب وتمدن کا بھی عینی مشاہدہ کیا۔ علامہ اقبال بھی

۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ء تک میونخ اور لندن میں حصول تعلیم میں مصروف رہے۔ میونخ میں فلسفہ میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی اور لندن میں قانون کا اعلیٰ امتحان پاس کیا۔ اس طرح دونوں عبقری شخصیتوں نے مشرق و مغرب کی علمی سرچشموں سے فیض حاصل کیا مگر ساتھ ہی قرآن اور رسول اکرم ﷺ کے ساتھ اپنا تعلق خاص جاری رکھا۔

جب استعماری طاقتیں مسلمانوں پر غالب آگئیں تو مصر و ہند بھی برطانیہ کے شکنجے میں آگئے۔ یوں دونوں شاعروں نے ایک جیسے ماحول میں تربیت پائی اور دونوں کو ایک جیسے حالات سے دوچار ہونا پڑا۔ شوقی نے جو برطانوی سامراج کے خلاف نغمے لکھے ان میں ''وداع اللورد کرومر'' بہت زیادہ مقبول ترانہ ہے جو مصر میں نوجوانوں نے گا۔ یا سیاسی قائدین نے اسے زبانی یاد کیا اور اپنی تقریروں میں اسے لوگوں کو سنایا۔ صرف مصر کیا تمام عرب ممالک میں یہ نغمہ زبان زد خاص و عام ہو گیا۔ حکومت برطانیہ نے اس جرمِ بے گناہی کی پاداش میں شوقی کو جلاوطن کیا اور انہیں پانچ سال اندلس میں جلاوطنی کی زندگی گزارنی پڑی۔

شوقی نے اندلس میں جو شاعری کی ہے وہ اندلسیات کے ادب میں نمایاں حیثیت کی حامل ہے۔ علامہ اقبال کو بھی ۳۱-۱۹۳۰ء کی گول میز کانفرنس (لندن) میں مسلمانوں کی نمائندگی کے بعد اندلس جانے کا موقع ملا۔ اس سے متاثر ہو کر انہوں نے بعض مشہور و معروف نظمیں لکھی ہیں جو بے مثال ہیں۔

اس لحاظ سے ان دونوں شاعروں کی شاعری کے درمیان بعض مماثلتیں پائی جاتی ہیں۔ مگر شوقی نے شاعری صرف عربی زبان میں کی ہے جبکہ علامہ اقبال نے اردو اور فارسی میں۔ دونوں شاعر وحدتِ اُمت کے پرزور داعی ہیں۔ اور اس کے لئے قرآن اور صاحب قرآن ﷺ کے ساتھ علمی اور روحانی ربط و تعلق کو لازم و ملزوم سمجھتے ہیں۔ دونوں افراد ملت

کے لئے بہتر کردار کو ضروری سمجھتے ہیں۔ عالم اسلام کے لئے مضبوط مرکز اور اسلامی نظام پر مبنی تہذیب وتمدن اور ثقافت کے دونوں پرزور نقیب ہیں۔

دونوں شاعروں نے ملّت کی بدحالی پر خون کے آنسو بہائے ہیں اور جو کچھ لکھا ہے دردمند دل سے لکھا ہے۔ اس دعوت میں اعتدال، توازن اور معقولیت ہے۔ شوقی اور اقبال کا خطاب اگرچہ امت مسلمہ سے ہے تاہم دونوں کی شاعری کے اقدار آفاقی ہیں۔

آج سے تقریباً پانچ سال پہلے ۲۰۱۲ء میں میں نے اقبال انسٹی ٹیوٹ آف کلچر اینڈ فلاسفی کی ڈائیریکٹرشپ کا عہدہ سنبھالا۔ میں چاہتی تھی کہ شوقی اور اقبال کی مماثلتوں کو اجاگر کیا جائے۔ میں نے اس کے لئے ڈاکٹر محمد سلطان اصلاحی کو ۲۰۱۳ء میں یہ پروجیکٹ تفویض کیا۔ اس پروجیکٹ کو ایک سال میں مکمل ہونا تھا لیکن "ہوئی تاخیر تو کچھ باعث تاخیر بھی تھا"۔

ڈاکٹر اصلاحی صاحب عربی زبان وادب کے ایک معروف استاد ہیں۔ اُنہوں نے احمد شوقی کی شاعری پر پی ایچ ڈی کیا ہے۔ کشمیر یونیورسٹی کے شعبۂ عربی میں تدریسی خدمات انجام دے چکے ہیں۔ ان کا مطالعہ بہت وسیع ہے۔ "شوقی اور اقبال" کی مماثلتوں پر ان کا یہ مقالہ نہایت وقیع اور پرمغز ہونے کے علاوہ علمی اور ادبی معلومات کا ایک انمول خزانہ بھی ہے۔ امید ہے کہ اسے علمی اور ادبی حلقوں میں سراہا جائے گا۔ دعا ہے کہ رب العزت اسے شرف قبولیت سے نوازے۔ (آمین)

پروفیسر تسکینہ فاضل

ڈائریکٹر اقبال انسٹی ٹیوٹ آف
کلچر اینڈ فلاسفی یونیورسٹی آف کشمیر سری نگر

۲۲/مارچ ۲۰۱۷ء

﴿باب اوّل﴾

شوقی اور اقبال

(مشاہیر کی نظر میں)

شوقی اور اقبال دو عظیم شاعر ہیں۔ دونوں اسلام کی ثقافتی اور فکری روایات سے بخوبی آگاہ تھے اور دل وجان سے اس پر فریفتہ۔ دونوں نے مغربی تہذیب وتمدن کا عینی مشاہدہ کیا تھا، اس کے علم وادب کی غواصی کی تھی۔ اس لحاظ سے وہ اس تہذیب کے حُسن و قبح کے رمزشناس بھی تھے۔ انہوں نے دیکھا کہ اس لادین تہذیب کے پاس اقتدار وغلبہ تو ہے، اس کے پاس مادّی فراوانی بھی ہے، یہ اس وقت تازہ دم اور صلاحیت سے بھرپور ہے اور دنیا میں ہر سو اسی کا ڈنکا بج رہا ہے۔ مگر اس کے باوجود اس میں قلب ونظر کا فساد ہے، اس کی مدنیت (Civilization) کی روح ناپاک ہے۔ اور زبردست بحران میں مبتلا ہے۔ اسلئے کہ یہ شاخ گل پہ بنا ہوا آشیانہ ہے جو ناپائدار ہے۔

دوسری طرف وہ تہذیب کہ جس پر وہ دل وجاں سے فریفتہ تھے، جس کی اساس کلمۂ طیبہ پر مبنی ہے، جس کی جڑیں زمین میں گہری جمی ہوئی ہیں اور شاخیں آسمان تک پہنچی ہوئی ہیں،[1] اس میں قلب ونظر کا علاج ہے، اس کی مدنیت کی روح عفیف ہے۔[2] اسلئے انہوں نے امت مسلمہ کو مخاطب کر کے حقیقت میں ساری انسانیت کو اسی صحتمند تہذیب اور عفیف مدنیت کی طرف دعوت دی ہے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ دعوت اگر عالمگیر ہے تو اس کے مخاطب امت مسلمہ ہی کیوں؟ خلیفہ عبدالحکیم، ''فکر اقبال'' میں اس سلسلہ میں لکھتے ہیں کہ!

> ''اسرارِ خودی کے انگریز مترجم پروفیسر نکلسن نے علامہ اقبال کو ایک خط میں لکھا کہ تمہارے مخاطب فقط مسلمان معلوم ہوتے ہیں اور فقط ان ہی کی اصلاح و بقا تمہارے مدنظر ہے۔ تمہارا خطاب

نوعِ انسان سے معلوم نہیں ہوتا۔ اس کے جواب میں علامہ مرحوم نے اس کو لکھا کہ نوعِ انسان میں خاص نظر اور طریقِ زندگی پیدا کرنے کے لئے یہ لازمی ہے کہ پہلے ایک ملت اس کا نمونہ پیش کرے اور میں سمجھتا ہوں کہ اپنے عقائد، اپنی تاریخ اور اپنی معاشرت کے مضمرات کی بنا پر اس ملت میں صلاحیت ہے اور مزید پیدا ہو سکتی ہے، کہ وہ ایک عالمگیر اخوت اور مساوات کی مثال پیش کر سکے، یہاں تک کہ اخوتِ اسلامی اخوتِ انسانی بن جائے"۔[3]

شوقی کو عربی، فرانسیسی اور ترکی تینوں زبانوں پر مہارت حاصل تھی مگر انہوں نے اپنی سخنوری کے لئے عربی زبان کا انتخاب کیا۔ اسی زبان میں کچھ نثری شہ پارے بھی لکھے ہیں۔[4]

اقبال اُردو، فارسی، عربی اور انگریزی چاروں زبانوں پر دسترس رکھتے تھے مگر انہوں نے اُردو، اور فارسی کو اپنے حیات بخش پیام کا وسیلہ بنایا۔ کچھ نگارشات انگریزی زبان میں بھی لکھ چھوڑی ہیں جو یادگارِ زمانہ ہیں۔ عربی زبان و ادب اس قدر جانتے تھے کہ قیامِ لندن کے دوران، اپنے استاد پروفیسر آرنالڈ کی غیر موجودگی میں لندن یونیورسٹی کے شعبۂ عربی میں تدریسی فرائض بھی انجام دیے ہیں۔[5]

شوقی مشاہیر کی نظر میں

متاخرین شعرائے عرب میں مصر کے شاعر شوقی بالاتفاق سب سے بڑے شاعر مانے گئے ہیں۔ احمد حسن زیات ان کے بارے میں رقمطراز ہیں:۔

''تقریباً تمام ہی ناقدوں کا اس بات پر اتفاق ہے کہ شوقی ان دس صدیوں کا نعم البدل ہے جن میں متنبی کے بعد سے عربی ادب کی تاریخ میں کوئی موہوبی صلاحیتیں رکھنے والا ایسا شاعر پیدا نہ ہوا جو وحی افکار کے منقطع سلسلہ کو جاری کرتا اور ادب کے فرسودہ اسلوب میں نئی روح پھونکتا''۔ [6]

مزید لکھتے ہیں کہ:۔

''شوقی اپنے دین کا پابند اور اپنی زبان وفن کا محافظ ہے''۔ [7]

ان کے دیوان ''الشوقیات'' کے مرتب ڈاکٹر محمد حسین ھیکل نے ان سے اپنے اختلافِ فکر کا ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے:۔

''فنِ شاعری میں ان کی پہاڑ جیسی شخصیت ناقابلِ تسخیر رہے''۔ [8]

ڈاکٹر شوقی ضیف، ''الأدب العربی المعاصر فی مصر'' میں لکھتے ہیں:۔

''۱۹۲۷ء میں جب ان کے دیوان ''الشوقیات'' کی دوبارہ اشاعت ہوئی تو ان کے اعزاز میں ایک عظیم الشان اجلاس منعقد کیا گیا جس میں مصر اور دیگر عربی ممالک کے نمائندوں نے شاعر مصر کی عظمت بیان کی۔ ان کی عبقریت اور قادر الکلامی کا اعتراف کیا۔ اسی اجلاس میں شعراء نے شوقی کے سر پر سخنوری کا تاج رکھا اور انہیں نہ صرف مصر بلکہ تمام عرب شعراء کا امیر تسلیم

کیا۔ شاعر النیل حافظ ابراہیم نے بھی شوقی سے اپنی بیعت کا اعلان کیا اور یوں گویا ہوا''

أميرَ القوافي قد أتيتُ مُبايعاً

وَهذي وفودُ الشرقِ قدبايعتْ معِي

''(اے شاعری کے تاجدار میں نے اور میرے ساتھ مشرق کے سارے وفود نے آپ کی امارت پر بیعت کی ہے)''[9]

طٰہٰ حسین نے شوقی کے خلاف لکھنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا لیکن ۱۹۳۴ء میں وہ بھی اعتراف کرتے ہیں کہ

''أنّ أميرَ الشُعَراء بعدَ شَوقي هُوَالعقاد، كذلك قال الرافعي. (مجلّة الأسبوع)''[10]

(بیشک امیر الشعراء شوقی کے بعد عقاد ہی ہیں، یہی بات مصطفیٰ صادق الرافعی نے بھی کہی۔)

مگر یہ اعتراف طٰہٰ حسین نے امیر الشعراء احمد شوقی کی وفات (۱۹۳۲ء) کے بعد کیا۔

کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ

ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

(غالبؔ)

ڈاکٹر ماہر حسن فہمی ''شوقی ...... شعرہ الاسلامی'' میں لکھتے ہیں کہ ''شوقی اس لحاظ سے ایک بڑا اسلامی شاعر ہے کہ اس کی شاعری امّت مسلمہ کے قضایا پر مشتمل ہے۔ جب اسلامی تعلیمات کے خلاف شبہات اور بدگمانیاں پھیلائی جاتی ہیں تو وہ مدافعت کرتا ہے۔ وہ اساسِ دینی پر اصلاح کے آرزومند ہیں۔ مسلمانوں کے خیر وفلاح کو دیکھ کر طرب کے نغمے الاپتا ہے۔ جب انہیں شر سے دوچار پاتا ہے تو آزردہ ہوجاتا ہے اور نالہ وفریاد کرتا ہے۔ وہ امّت مسلمہ کو ان کا شاندار ماضی یاد دلا کر غفلت کی نیند سے بیدار کرتا ہے۔ اغیار

کے طوق وسلاسل سے آزاد، ان کی باوقار شریفانہ اور دیندارانہ زندگی دیکھنے کا متمنی ہے اور اسلام کے سایۂ عاطفت میں وحدتِ امّت کا خواہشمند ہے۔ اس طرح کے اسلامی موضوعات اور کثرتِ نواحی کو (جن پر شوقی نے لکھا ہے) ہم محمد اقبال کے سوا کسی اور اسلامی شاعر میں نہیں پاتے ہیں۔ یہ امر مسلّم ہے کہ شوقی کی زندگی کا مقصد ملّت اسلامیہ کی شیرازہ بندی اوران کی آزادی تھی۔

انہیں اپنے اس مقام ومرتبہ کا بخوبی احساس تھا چنانچہ فرماتے ہیں:

کانَ شعریُ الغناءَ فی فَرحَۃِ الشّر
قِ وکانَ العزاءَ فی أحزانہِ

''مشرق یعنی امت مسلمہ کی شادمانی میں میری شاعری طرب کا نغمہ ہے جبکہ غم وآلام میں وہ اس کی نوحہ خوانی ہے''۔[11]

اقبال مشاہیر کی نظر میں

اقبال کی شاعری میں ایک ہمہ گیر پیغام ہے ۔ شائد اسی لئے وہ کہہ گئے ہیں کہ '' خدا اس شخص کو نہ بخشے جس نے مجھے شاعر جانا'' [۱۲]

پروفیسر رشید احمد صدیقی ان کے متعلق لکھتے ہیں:۔

'' اقبال کا کلام ہمارے لئے اس صدی کا علم کلام ہے جو ایک لامعلوم اور طویل مدت تک تازہ کار رہے گا، اسلیئے کہ وہ ایک عظیم شاعری میں ڈھل چکا ہے، اسلامی عقائد شعائر اور روایات کا جس عالمانہ، عارفانہ اور شاعرانہ انداز سے اپنے بے مثل کلام میں اقبال نے وکالت کی ہے، اس سے مسلم معاشرہ حیرت انگیز طور پر متاثر ہوا ہے، ایسی صحت مند اور با مقصد بیداری کا امتیاز شائد ہی کسی اور عہد کے علم کلام کے حصہ میں آیا ہو''۔ [۱۳]

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم لکھتے ہیں کہ

'' اقبال شاعر بھی ہے اور مفکر بھی ۔ وہ حکیم بھی ہے اور کلیم بھی ۔ وہ خودی کا پیغامبر بھی ہے اور بے خودی کا رمز شناس بھی ۔ وہ تہذیب وتمدن کا نقاد بھی ہے اور محی الملت بھی ۔ وہ توقیر آدم کا مبلّغ بھی ہے اور تحقیر انسان سے دردمند بھی ۔ اس کے کلام میں فکر و ذکر ہم آغوش ہیں اور خبر و نظر آئینۂ یکدگر ۔ ایسے ہمہ گیر دل و دماغ کے مالک اور صاحب عرفان و وجدان کے افکار اور تاثرات کا تجزیہ اور اس پر تنقید کوئی آسان کام نہیں ۔ اس نے زیادہ تر شعر ہی کو ذریعہ اظہار بنایا کیونکہ فطرت نے اس کو اسی حیثیت سے تلمیذ الرحمن بنایا تھا''۔ [۱۴]

مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ فرماتے ہیں کہ:۔

''سب سے بڑی چیز جو مجھے ان (اقبالؒ) کے فن کی طرف لے گئی۔ وہ بلند حوصلگی، محبت اور ایمان ہے جس کا امتزاج اُن کے شعر اور پیغام میں ملتا ہے اور جس کا ان کے معاصرین میں کہیں پتہ نہیں لگتا۔ میں بھی اپنی طبیعت اور فطرت میں انہی تینوں کا دخل پاتا ہوں۔ میں ہر اس ادب اور پیغام کی طرف بے اختیارانہ بڑھتا ہوں جو بلند نظری، عالی حوصلگی اور احیاء اسلام کی دعوت دیتا اور تسخیر کائنات اور تعمیر انفس و آفاق کے لئے ابھارتا ہے۔ جو مہر و وفا کے جذبات کو غذا دیتا اور ایمانی شعور کو پیدا کرتا ہے، جو محمد ﷺ کی عظمت اور اُن کے پیغام کی آفاقیت و ابدیت پر ایمان لاتا ہے۔

میری پسند اور توجہ کا مرکز وہ اسی لئے ہیں کہ وہ بلند نظری محبت اور ایمان کے شاعر ہیں۔ ایک عقیدۂ دعوت اور پیغام رکھتے ہیں اور مغرب کی مادّی تہذیب کے سب سے بڑے ناقد اور باغی ہیں۔ وہ اسلام کی عظمت رفتہ اور مسلمانوں کے اقبالِ گزشتہ کے لئے سب سے زیادہ فکر مند، تنگ نظر قومیت و وطنیت کے سب سے بڑے مخالف اور انسانیت و اسلامیت کے عظیم داعی ہیں''۔ 15

ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی جو 1914ء سے سفر و حضر میں علامہ کے قریب رہے ہیں لکھتے ہیں کہ:۔

''اقبال کا شروع سے یہ نقطۂ نظر تھا کہ اسلام ایک مکمل ضابطۂ حیات

ہے اور دنیا کے تمام مسائل کا حل اسلام کے زریں اصولوں میں مضمر ہے۔ انہوں نے زندگی بھر اسی نقطہ خیال کا پرچار کیا اور اسلام کو ایک عالم گیر مسلک کے طور پر پیش کرتے رہے۔ انہیں یقین تھا کہ ایک نہ ایک دن ملّت اسلامیہ ایک مرکز پر ضرور جمع ہوگی اور پھر یہ ملّت پوری دنیا کی رہنمائی کے فرائض انجام دے گی"۔ [16]

سیّد مودودیؒ فرماتے ہیں کہ:۔

"سب جانتے ہیں کہ اقبال نے یہی مغربی تعلیم حاصل کی تھی جو ہمارے نوجوان انگریزی یونیورسٹیوں میں حاصل کرتے ہیں۔

لیکن اس کے باوجود اس شخص کا کیا حال تھا؟ مغربی تعلیم و تہذیب کے سمندر میں قدم رکھتے وقت وہ جتنا مسلمان تھا، اس کے منجدھار میں پہنچ کر اس سے زیادہ مسلمان پایا گیا۔ اس کی گہرائیوں میں جتنا اترتا گیا اتنا ہی زیادہ مسلمان ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ اس کی تہہ میں جب پہنچا تو دنیا نے دیکھا کہ وہ قرآن میں گم ہو چکا ہے قرآن سے الگ اس کا کوئی فکری وجود باقی ہی نہیں رہا۔ وہ جو کچھ سوچتا تھا جو کچھ دیکھتا تھا، قرآن کی نظر سے دیکھتا تھا۔ حقیقت اور قرآن اس کے نزدیک شے واحد تھے اور اس شے واحد میں وہ اس طرح فنا ہو گیا تھا کہ اس دور کے علماء دین میں بھی مجھے کوئی ایسا شخص نظر نہیں آتا جو فنائیت فی القرآن میں اس امامِ فلسفہ اور اس ایم۔اے، پی ایچ ڈی، بارایٹ لا سے لگا کھاتا ہو۔

بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ آخری دور میں اقبال نے تمام کتابوں کو الگ کر دیا تھا اور سوائے قرآن کے اور کوئی کتاب وہ اپنے

سامنے نہ رکھتے تھے......

''رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ مبارک کے ساتھ ان کی والہانہ عقیدت کا حال اکثر لوگوں کو معلوم ہے مگر کسی کو یہ معلوم نہیں کہ انہوں نے اپنے سارے تفلسف اور اپنی تمام عقلیت کو رسول عربی ﷺ کے قدموں پر ایک متاعِ حقیر کی طرح نذر کر کے رکھ دیا تھا''۔ [17]

شوقی اور اقبال کے فکر و فن پر بہت کچھ لکھا گیا ہے، آج بھی لکھا جا رہا ہے اور آئندہ بھی لکھا جائے گا۔ اس بات میں ہم نے چند نامور ادباء و فضلاء اور مقتدر علماء کی آراء کو پیش کرنا مناسب جانا تا کہ یہ بات سامنے آجائے کہ دونوں شاعر اگر چہ دو براعظموں میں ایک دوسرے سے بہت دور رہتے تھے اور ان کے مابین کوئی رسم و راہ بھی نہ تھی۔ مگر اس دوریٔ مسافت کے باوجود ان کے درمیان بہت سی فکری مماثلتیں پائی جاتی ہیں۔

ہم نے اپنے آشیانے کے لئے
جو چبھے دل میں وہی تنکے لئے

اس لحاظ سے یہ کاوش موازنہ ہے نہ مقارنہ بلکہ ان ہی چند مماثلتوں کو یکجا کرنے کی اک سعیٔ ناتمام ہے جو ملّت کے ان بہی خواہوں اور دردمندوں کے درمیان قدرِ مشترک کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ہم انہیں ایک حسین و جمیل گل دستہ کہہ سکتے ہیں جس میں لرزتے آنسو، خونِ تمنا کی آہیں اور خاک شدہ آرزوؤں کی حسرتیں ہیں۔ مگر یاسیت اور قنوطیت سے کوسوں دور، احساسِ شکست سے مُبرّا، ایسا حیات بخش پیام کہ جس میں کانٹوں سے الجھ کر زندگی کرنے کی خو کا درس ہے اور گل زارِ ہستی میں عزت و آبرو کی زندگی بسر کرنے کی تلقین ہے۔

☆☆☆☆

58366
153|153
20930

حوالہ جات

۱۔ القرآن الکریم، سورۃ، ابراھیم، ۲۴، ۲۵، ۲۶۔

۲۔ ایضاً، سورۃ یونس، ۵۷، ۵۸۔

۳۔ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم، فکر اقبال، علی گڑھ، ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۲۰۰۲ء ص ۱۱۹، ۱۲۰۔

۴۔ الدکتور شوقی ضیف، شوقی شاعر العصر الحدیث، القاھرۃ، دار المعارف، ۱۹۸۶ء، ص ۱۳۔

مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیں۔

الدکتور شوقی صنیف، الأدب العربي المعاصر، فی مصر، القاھرۃ، دار المعارف، ۱۹۹۵ء، ص ۱۱۴۔

۵۔ الندوی، ابوالحسن علی الحسنی، روائع اقبال، لکناؤ، الھند، المجمع الاسلامی العلمی، ۱۹۷۸ء ص ۲۶، ۲۷۔

مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیں۔

ڈاکٹر فرمان فتحپوری، اقبال سب کے لئے، دہلی، ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۲۰۱۲ء، ۱۷۔

۶۔ زیات، استاد احمد حسن، تاریخ ادب عربی، مترجم عبدالرحمٰن طاہر سورتی، دہلی، قاری پبلی کیشنز، ۲۰۰۴ء، ص ۵۹۱۔

۷۔ ایضاً ص ۵۹۱۔

۸۔ احمد شوقی، الشوقیات، الجزء الاوّل، مصر، مکتبة التجارية الکبریٰ، ۱۹۷۰ء، ص ۳، ۱۰۔

۹۔ الدکتور شوقی صنیف، الأدب العربي المعاصر فی مصر، القاھرۃ، دار المعارف، ۱۹۹۵ء، ص ۱۱۳۔

۱۰۔ أنور جندی، المعارك الأدبية فی مصر منذ ۱۹۱۴ء ۱۹۳۹ء، القاھرۃ، مُکتبة الأنجلو المصرية، ۱۹۸۳ء، ص ۴۴۲۔

۱۱۔ دکتور ماھر حسن فہمی، شوقی۔ شعرہ الاسلامی، القاھرۃ، دار المعارف بمصر، ۱۹۵۳ء، ص ۲۱۱، ۲۱۲۔

۱۲۔ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم، فکر اقبال، ص ۱۰۔

۱۳۔ ندوی، ابوالحسن علی، نقوش اقبال، عربی کتاب ''روائع اقبال'' کا ترجمہ از مولوی شمس تبریز خان، لکھنو، مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، ۲۰۰۷ء، ص ۲۰۔
۱۴۔ فکر اقبال، ص ۹۔
۱۵۔ نقوش اقبال، ص ۲۸، ۲۹۔
۱۶۔ ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی، اقبال کی صحبت میں، لاہور، مجلس ترقی ادب، ۱۹۷۷ء، ص ۵۲۵، ۵۲۶۔
۱۷۔ مودودی، سید ابوالاعلیٰ، شخصیات، دہلی، ذکری انٹرنیشنل پبلشرز، ۲۰۰۶ء، ص ۲۱۹، ۲۲۰۔

☆☆☆☆

﴿باب دوم﴾

عالمِ اسلام
استعماریت کی زد میں

عالمِ اسلام استعماریت کی زد میں

انیسویں صدی کے وسط میں عالمِ اسلام کو بڑے ہی صبر آزما، بہت ہی پیچیدہ اور حد درجہ پر آشوب حالات سے دو چار ہونا پڑا۔ مسلمانوں پر افتادگی اور پژمردگی چھائی تھی۔ اربابِ علم وفکر پر تعطّل و جمود طاری ہو گیا تھا اور یہ قافلہ جو کبھی سخت جاں تھا، اُسی سرحد پر کھڑا تھا جہاں سے اٹھارویں صدی میں گزرا تھا۔[1]

دوسری طرف یورپ میں صنعتی انقلاب بپا ہو چکا تھا۔ اہلِ مغرب علم وادب، تہذیب وتمدن اور اقتصادی وفوجی طاقت میں زبردست ترقی کر رہے تھے۔ وہ اس طرح سے حاصل شدہ قوت کو اپنے استعماری منصوبوں میں استعمال کر رہے تھے۔ عالمِ اسلام کے وسیع اور زرخیز ممالک اس خطرہ کی زد میں تھے۔[2]

عثمانی خلافت نے ایک طویل عرصہ تک اس کا مقابلہ کیا۔ یہ خلافت اپنی تمامتر کمزوریوں کے باوجود امّت مسلمہ کے درمیان اتحاد ویگانگت کا ایک رمز تھی۔ اس میں عرب، کرد، ترک، دیگر رنگ ونسل اور زبانوں سے تعلق رکھنے والے مسلمان ایک ہی تسبیح میں پروئے ہوئے تھے۔ غیر مسلم اقلیتوں کو بھی یکساں عدل وانصاف میسّر تھا۔ یہ لوگ مسلمانوں کے ساتھ سکون واطمینان کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ اس لئے یہ خلافت یورپ کے استعماری منصوبوں میں سب سے بڑی رکاوٹ تھی۔ اس وجہ سے یہ ان کے دلوں میں کانٹے کی طرح کھٹکتی تھی۔ وہ اس کے خلاف موقعہ کی تلاش میں تھے۔[3]

امّت مسلمہ کے لئے یہ ایک انتہائی دشوار اور نازک مرحلہ تھا۔ مؤرخ اسلام ابوالحسن علی ندویؒ اس صورتحال کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

> ''اس نازک اور دشوار تجزیہ سے عہدہ برآ ہونے کے لئے اعلیٰ درجہ کی ذہانت اسلام اور مغربی تہذیب سے گہری واقفیت اور بہت بڑی جرأت کی ضرورت تھی ، یہ درحقیقت ایک مجتہدانہ کام تھا، جس کو ترکی کو چاروناچار انجام دینا تھا، جس میں سارا عالمِ اسلام اس کی تقلید اور پیروی کے لئے تیار تھا، اسی کام کی تکمیل پر عالمِ اسلام کی تہذیبی وفکری اور کسی حد تک دینی وسیاسی مستقبل کا بھی انحصار تھا، اس ضرورت کو نہ تو ٹالا جاسکتا تھا، نہ سرسری طور اس سے گزرا جاسکتا تھا، نہ اس کے لئے کوئی مہلت لی جاسکتی تھی، یہ ایک ناگزیر فریضہ تھا، جس کو جلد سے جلد ادا ہونا چاہئے تھا اور جس کو ہر مسئلہ پر مقدم رکھنا چاہئے تھا''۔[۴]

مگر استعماری سازشوں اور یورشوں نے عثمانیوں کو اس طرح سوچنے کی مہلت نہ دی۔ حالانکہ یہ ان کا فریضۂ منصبی تھا۔ ۱۸۵۹ء میں روس اور برطانیہ نے مل کر خلافت کو ختم کرنے اور اس کے باقیات کو باہم تقسیم کرنے کے لئے باضابطہ طاقت کا استعمال کیا۔ جب وہ اس میں ناکام ہو گئے تو انہوں نے باہر سے حملہ کرنے کے بجائے خلافت کو اندر سے کھوکھلا کرنے کی سعی وجہد شروع کی۔ چنانچہ سب سے پہلے برطانیہ نے اپنے جاسوسوں کو عرب بھیجنا شروع کیا۔ ان کا کام عرب زعماء سے ملنا اور انہیں برطانیہ کی جانب سے اسلحہ اور ذخائر فراہم کرنا اور جو کچھ وہ مطالبہ کریں اس کا وعدہ کرنا تھا۔ مگر کام صرف ایک مطلوب تھا، ''الثورۃ العربیۃ ضدّ الاتراک'' (ترکوں کے خلاف عربی بغاوت) یہ گویا عُروبہ (Arabdom) کا سور پھونکا گیا تا کہ عرب اور عجم اس قومیت کی تخم ریزی سے

تقسیم ہو جائیں۔[5]

پھر ان ہی جاسوسوں نے مسلم ممالک کو تقسیم در تقسیم کرنے کے لئے عربوں کو اقلیمیت (Regionalism) کی شراب پلائی۔ وہ اس طرح سے کہ مصریوں سے کہا کہ آپ فراعنہ کی اولاد ہیں، لبنانیوں کو اپنی فینقی تہذیب یاد دلائی، عراقیوں کو بابلی اور آشوری تہذیب کی لوریاں سنائیں اور اسی طرح اہلِ حجاز کو باور کرایا کہ آپ کے امجاد عرب ہیں۔ اسلئے خلافت کا حق آپ ہی کو حاصل ہے۔ اصل میں یہ اس دور کے آزر کے تراشے ہوئے بت تھے جن کے پیرہن سے دین وخلافت کا کفن تیار کرنا اور ملت کا شیرازہ بکھیرنا مقصود تھا۔ یوں انگریز، امّت مسلمہ کے خلاف اپنی مشہور چال ''پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو'' (Divide in order to Conquer) پر عمل پیرا تھے۔[6]

ان پر آشوب حالات میں سلطان عبدالحمید ثانی نے ۱۸۷۶ء میں مملکت عثمانیہ کی باگ ڈور سنبھالی۔ ان کا عہد خلافت بتیس سال تک (۱۸۷۶۔۱۹۰۸) قائم رہا۔ یہ مملکت ترکی کے علاوہ ایشیاء میں شام، عراق اور جزیرۃ العرب پر مشتمل تھی جبکہ افریقہ میں تونس، طرابلس، مصر اور سوڈان اسی مملکت سے وابستہ تھے۔[7] سلطنت اندرونی انتشار اور بیرونی یلغار سے دوچار تھی۔ مستغربین نے سلطان کے خلاف کیچڑ اچھالنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں رکھا۔ اس قدر جھوٹے الزامات کا ڈھنڈورا پیٹا کہ رعایا کے لئے سچ اور جھوٹ میں تمیز کرنا دشوار ہو گیا۔ یہ سارا کام عیسائی مشنریوں اور فری میسنری (Freemasonry) کے جاسوسوں نے خلیفہ وخلافت کے خلاف نفرت پھیلانے کے لئے انجام دیا۔ صرف اسی پر بس نہیں کیا بلکہ ایک گہری سازش کے تحت صیہونیت (Zoonism) کے قائد تھیوڈر ہرزل (Theodor Herzl) ایک خطیر رقم (Enormous Sum) کی لالچ دینے کے لئے سلطان (عبدالحمید الثانی) کے پاس گئے تاکہ وہ ارضِ فلسطین کا کچھ حصہ یہودیوں کے لئے عنایت فرمائیں۔ مگر اس

باحمیت اور خوددار سلطان کا جواب یہ تھا کہ ''جب عثمانی سلطنت نہیں رہے گی اور خلافت کا خاتمہ ہو جائے گا، تب کہیں آپ فلسطین میں یہودیوں کے لئے وطن کا مطالبہ کر سکتے ہیں''۔ [8]

مگر برطانوی جاسوس اور ان کی حکومت اس بات سے آشنا تھے کہ عثمانیوں کے خلاف عربوں کا پارہ چڑھ گیا ہے۔ ''آزادی اور قومی حکومت'' کی امنگ سے ان کی نیند اچٹ گئی ہے۔ اب وہ رات دن اسی فکر میں کروٹیں بدلتے رہتے ہیں۔

بلادعربیہ کو اپنے محل وقوع کے لحاظ سے دنیا میں جو اہمیت حاصل ہے حکومت برطانیہ اس سے غافل نہ تھی۔ اس لئے ان کی نگاہِ انتخاب شریف حسین بن علی (۱۸۵۶، ۱۹۳۱) امیر مکہ پر پڑی جو حارسِ الحرمین (Guard of Haramain) بھی تھے۔ اس محترم اور مقتدر مقام پر وہ خود بھی عرب مملکت اور اپنی بادشاہت کے خواب دیکھ رہے تھے۔ اس کے لئے وہ عراق، شام اور الجزیرۃ العربیۃ کو ایک ہی وحدت میں پرونے کی آرزو رکھتے تھے۔ [9]

برطانوی جاسوس کرنل لورنس (Colonal Lawrence) نے اپنے زبانی جمع خرچ سے شریف حسین کو خوب سبز باغ دکھائے اور انہیں عثمانیوں کے خلاف بغاوت پر آمادہ کیا۔ اس وقت شریف حسین کے چاروں شہزادے خلیفہ عبدالحمید کے دربار میں تھے۔ اور شہزادہ فیصل بن حسین چھے سال تک خلیفہ کے پرائیویٹ سیکرٹری (Private Secretary) بھی رہ چکے تھے۔ شریف حسین، لورنس کے جھانسے میں آگیا اور اس نے اپنے چاروں بیٹوں کو مکہ واپس بلایا۔ مکہ آتے ہی انہیں حُجاج کے راستوں کی پیٹرولنگ پر مامور کیا۔ [10]

حکومت برطانیہ اس بات سے بھی آگاہ تھی کہ فرانس شریف حسین کی اس طرز حکومت پر راضی نہیں ہوگا کیونکہ شام اور لبنان کے معاملے میں فرانسیسی حکومت کے پیش

نظر کچھ خاص مصلحتیں تھیں۔ اسلئے ان دونوں ممالک (برطانیہ اور فرانس) کے درمیان پہلی جنگِ عظیم (۱۹۱۴ء-۱۹۱۹ء) کے دوران ہی ۹ مئی ۱۹۱۶ء کو ایک خفیہ معاہدہ طے پایا۔ یہ معاہدہ سائیکس۔ پیکاٹ (Sykes-Picot Agreement) کے نام سے معروف ہے۔ اس معاہدہ کا مقصد عثمانی خلافت کا خاتمہ کرنا، وحدتِ امت کو پارہ پارہ کرنا، ان کی بندر بانٹ کرنا اور اسرائیل کی صورت میں عربوں کے سینے میں میخ ٹھونک کر انہیں زمین کے ساتھ پیوستہ کرنا تھا تاکہ دوبارہ ان کے لئے اٹھنا اور سر اٹھا کر جینا دشوار ہو جائے۔ [11]

اس طرح شریف حسین اور ان کے شہزادے شطرنج کے مہرے نظر آتے ہیں۔ کیونکہ معاہدہ سائیکس۔ پیکاٹ کے ایک ماہ بعد ہی شریف حسین ۱۰/جون ۱۹۱۶ء کو برطانیہ کی عسکری اور مالی مدد سے عثمانیوں کے خلاف عربی بغاوت (الثورۃ العربیۃ) کا اعلان کرتے ہیں۔ اپنے بیٹے شہزادہ فیصل کو فوج کا کمانڈر بناتے ہیں اور برطانوی جاسوس کرنل لورنس ان کے ساتھ ساتھ ہوتے ہیں۔ [12]

جب عربوں نے تہلیل وتائید سے اس بغاوت کا استقبال کیا تو غیر عرب مسلمانوں کے سروں پر ایک بجلی گری۔ خاص طور پر ترکی اور ہندی مسلمانوں پر تو کوہِ غم ٹوٹا۔ عثمانیوں نے کئی بار صلح کی تگ ودو کی لیکن عربوں نے کوئی مثبت جواب نہ دیا۔ ترکوں کے کمانڈر انچیف جمال پاشا نے امیر فیصل کو معاہدۂ سائیکس۔ پیکاٹ کے حقائق سے بھی آگاہ کیا لیکن شہزادہ فیصل نے اسے بہرے کانوں سنا۔ جمال پاشا نے شہزادہ فیصل کی خدمت میں نصِ معاہدہ (معاہدہ کا متن) بھی ارسال کیا مگر شہزادہ موصوف نے نصِ معاہدہ کو بھی درخورِ اعتنا نہ سمجھا۔ [13]

مگر اس سے عربوں کی وحدت اور خود مختاری کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔ ہاں شریف حسین کو چند سال کے لئے (۱۹۱۶ء-۱۹۲۴ء) حجاز کی بادشاہت مل گئی۔ مگر اس کے صلہ میں امتِ مسلمہ کو ایک اور زخمِ کاری لگا۔ چنانچہ ۱۶/نومبر ۱۹۱۷ء کو بالفور اعلانیہ (Balfaur

(Declaration کے تحت ارضِ فلسطین میں اسرائیل کو عدم سے وجود میں لانے کا مژدۂ جان کاہ سنایا گیا اور برطانیہ نے اسے تسلیم کیا اس حال میں کہ وہاں نوے فیصد (Ninety Percent) عرب آباد تھے۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد دنیا کی ہر جہت سے یہودیوں نے فلسطین میں کثرت سے آباد ہونا اور وہاں کے اصل مکینوں کو بے گھر کر دینا شروع کیا۔[14]

۱۹۲۴ء میں شریف حسین اس وقت غریب الوطن ہوئے۔[15] جب مملکت سعودیہ کے مؤسس عبدالعزیز بن سعود (۱۸۸۰۔۱۹۵۳) نے ان سے حجاز کی بادشاہت چھین لی اور اس کا نیا نام ''المملکۃ العربیۃ السعودیۃ'' رکھا۔[16] یہ بات غور طلب ہے کہ اس وقت مملکت برطانیہ شریف حسین کے کام نہ آئی۔ کیونکہ شریف حسین نے خود ہی بادشاہت کے بجائے خلافت کا اعلان کیا تھا۔ جبکہ نجد کے عبدالعزیز بن سعود نے شریف حسین کو غریب الوطن کرنے کے بعد حجاز کا نام المملکۃ العربیۃ السعودیۃ رکھا نہ کہ المملکۃ العربیۃ الاسلامیۃ ، یہ ادا حکومت برطانیہ کو بھی پسند آئی کیونکہ یہ معاہدہ سائیکس پیکاٹ کے منشا کے عین مطابق تھی۔

شریف حسین کے ایک بیٹے شہزادہ عبداللہ کو اردن کا بادشاہ بنایا گیا۔ دوسرے بیٹے شہزادہ فیصل کو فرانس نے اپنی مصلحتوں کے پیش نظر شام میں ٹکنے نہ دیا۔ لیکن بعد میں انہیں بغداد (عراق) کی بادشاہت عنایت کی گئی۔[17] دراصل یہ کوئی انعام واکرام نہیں تھا بلکہ ایک وسیع وعریض اسلامی مملکت کو استعماریوں کے ایک طے شدہ منصوبے کے تحت ٹکڑے ٹکڑے کرنے کی عملی کاروائی تھی۔ پہلے اس کے دو ٹکڑے کئے۔ (عرب اور ترکی) پھر سرزمین عرب کو بھی مزید چار حصوں میں تقسیم کیا۔ (المملکۃ العربیۃ السعودیۃ، اردن، عراق اور شام)

سلطان عبدالحمید ثانی کی معزولی (۱۹۰۹) سے خلافت اور عثمانی سلطنت کو

زبردست دھچکا لگا۔ اسے رہے سہے متعدد اسلامی ممالک سے دست بردار ہونا پڑا۔ جب عرب ممالک میں اسلامیت کے بجائے قومیت اور وطنیت کو اپنایا گیا اور خلافت کے بجائے اقلیمیت کو ترجیح دی گئی تو نتیجتاً ترکی میں بھی ضیا گوک الپ (۷۶۔۱۸۷۵۔۱۹۲۴) کے فلسفہ قومیت کو فروغ ملا۔ پھر مصطفیٰ کمال اتاترک (۱۸۸۱۔۱۹۳۴) نے ۱۹۱۹ء میں خلافت اور عثمانی سلطنت کے خاتمہ کا اعلان کیا اور ترکی میں ایک غیر مذہبی جمہوریہ قائم کیا جس کے ۱۹۲۴ء میں وہ پہلے صدر منتخب ہوئے۔[18]

سید ابوالحسن علی ندوی کمال اتاترک کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

"اتاترک نے ترکی زندگی سے اسلامی اور عربی عنصر کو دور کردینے میں حیرت انگیز و بے نظیر کامیابی حاصل کی، ترکوں کے علاوہ اگر کوئی دوسری قوم ہوتی تو اس کا رشتہ اسلام سے اور اپنے ماضی سے ہمیشہ کے لئے کٹ چکا ہوتا اور اسلامی دنیا میں ایک دوسرے اسپین کا تجربہ ہوتا، لیکن ترک قوم موروثی ونسلی طور پر اسلام کی ایسی وفادار ہے، اسلام کے ساتھ نبی عربی ﷺ، دین حجازی اور اس کے مرکز اور اس کی ملت کے ساتھ اس کو ایسا جذباتی، روحانی اور قلبی لگاؤ ہے، اسلام کے ساتھ اس کے تعلق کی بنیاد ایسے مخلص ہاتھوں سے اور ایسی مبارک گھڑی میں رکھی گئی کہ ترک مجموعی اور ملی طور پر ابھی تک اسلام سے وابستہ ہیں، ایک سیاح کو ان کے اندر محبت کی جو حرارت، ایمان

کی جو طاقت اور اسلام کے لئے جو گرم جوشی محسوس ہوتی ہے، وہ کم مسلمان قوموں میں نظر آتی ہے"۔ [19]

مصر وہند استعماریت کی زد میں:۔

۱۴۹۸ء میں ایک پرتگالی جہاز ران واسکوڑے گاما (۱۴۶۹۔۱۵۲۴ء، Vasco de Gama) نے ہندوستان کا بحری راستہ دریافت کیا۔ اسے ایک عرب جہازران نے جنوبی افریقہ کی بندرگاہ راس امید (راس الرجاء الصالح، Cape of Good Hope) سے رہنمائی کی تھی۔ [20] اس کے بعد برطانیہ اور فرانس کے سوداگروں نے ہندوستان آنا جانا شروع کیا۔ رفتہ رفتہ ان کے درمیان ایک دوسرے سے سبقت حاصل کرنے کے لئے کشمکش شروع ہوگئی۔ ان ہی اقتصادی اور استعماری مقاصد کے پیش نظر فرانس نے نپولین کی فوجی قیادت میں جولائی ۱۷۹۸ء میں مصر پر قبضہ جمایا جو ستمبر ۱۸۰۱ء (تین سال اور دو مہینے) تک قائم رہا۔ [21] پھر ۱۸۸۲ء میں عرابی پاشا کی انقلابی بغاوت کی ناکامی نے برطانیہ کو مصر میں مداخلت کا موقع فراہم کیا۔ اس کے بعد مصر انگریزوں کی کینہ پرور استعماریت کے نذر ہوگیا۔ [22]

ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی (East India Company) ۱۶۰۰ء میں قائم ہوگئی تھی۔ مگر اورنگ زیب عالم گیرؒ (۱۶۱۸۔۱۷۰۷) کے عہدِ حکومت تک (۱۶۵۸۔۱۷۰۷) [23] انہیں کوئی نمایاں کامیابی حاصل نہ ہوسکی۔ ۱۷۰۷ء میں عالم گیر کی وفات کے بعد مرکز کمزور ہوگیا۔ اس کے بعد انگریزوں نے کھل کر ہندوستان کے اندرونی معاملات میں مداخلت شروع کی۔ [24] انہیں میر جعفر اور میر صادق جیسے غدّار بھی مل گئے۔ میر جعفر بنگال کے نواب سراج الدولہ کی فوج کے سپہ سالار تھے اور میر صادق میسور کے نواب ٹیپو سلطان کے وزیر تھے۔ لارڈ کلایو نے میر جعفر کے ساتھ ساز باز کر کے بنگال کے

صوبیدار سراج الدولہ کو ۲۳ رجون ۱۷۵۷ء میں چالاکی اور عیاری سے شکست دی۔ یہ ہندوستان میں برطانوی استعماریت کی تمہید تھی۔ [۲۵] پھر ۱۷۹۹ء میں میر صادق نے انگریزوں سے سازباز کر کے شیر میسور نواب ٹیپو سلطان کو شہید کروایا۔ اس خداترس، دیندار، دوُربین، مدبّر اور بہادر حکمران کی شہادت کے بعد انگریز دکن (جنوبی ہند) پر قابض ہو گئے۔ [۲۶] شہید سلطان انگریزوں کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ تھے۔ ان کی شہادت کے بعد جنوبی اور مشرقی ہند میں مسلمانوں کا دائرہ حیات تنگ ہو گیا۔ انگریزوں کے توسیع پسندانہ عزائم میں اور زیادہ اضافہ ہوا۔ یہاں تک کہ ۱۸۵۷ء میں مغلیہ سلطنت کے آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر کو گرفتار کر کے رنگون جیل میں بند کر دیا اور سارے ہندوستان پر مسلط ہو گئے۔ اس ہزیمت سے ہندی مسلمان مُضمحل اور شکستہ خاطر ہو گئے اور ان کی عزّت و خودداری پر ضربِ کاری لگی۔

سادگئ مسلم

خلافت اگر جسم ہے تو مکۂ معظمہ اس کا دھڑکتا ہوا دل اور مدینہ منورہ اس کی روح ہے۔ برطانوی جاسوس کرنل لورنس نے جب شریف مکۂ حسین بن علی کو خلافت اور عثمانی سلطنت کے خلاف بغاوت پر آمادہ کیا تو اس نے حقیقت میں خلافت کے دل پر شب خون مارا۔ جب حکومت برطانیہ کی پشت پناہی سے شریف حسین، عثمانیوں کو سرزمین حجاز سے باہر دھکیلنے میں کامیاب ہو گئے تو خلافت مسلوب القلب اور بے جان ہو کر رہ گئی۔ شریف حسین اور اُن کے شہزادوں کی الگ الگ مملکتوں کا قیام وحدت امّت کو پارہ پارہ کر دینے کے مترادف تھا۔ اصل میں خلافت ہی وحدتِ امّت کا ایک رمز (Symbol) تھی نہ کہ عرب قومیت (عُروبہ ,Arabdom) ہم نے اوروں کی عیاری اور اپنی سادگی سے خلافت کی قبا کو چاک کیا۔ جب مرکز نہ رہا تو تصوّرِ امّت کی جگہ قومیت نے لے لی اور

خلافت کی جگہ اقلیمیت سجادہ نشین ہوگئی۔ مستشرقین (Orientalists) اور استعماریوں نے اسلام کو عرب نیشنلزم کا لبادہ اوڑھنے کی بھرپور کوششیں کیں۔ مغرب کی اندھی تقلید میں مسلم حکمرانوں نے بھی دین اور سیاست میں تفریق پیدا کی۔ یوں امت کا شیرازہ بکھر گیا۔ مسلم ممالک استعماریت کا تر نوالہ بن گئے اور مسلمانوں کے لئے اللہ کی زمین اپنی تمامتر وسعتوں کے باوجود تنگ ہوگئی۔

☆☆☆☆

حوالہ جات

۱۔ ندوی، ابوالحسن علی، مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش، لکھنو، مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، ۲۰۰۳ء، ص ۵۵۔

۲۔ دکتور ماہر حسن فہمی، شوقی شعرہ الاسلامی، القاہرۃ، دار المعارف بمصر، ۱۹۵۳ء، ص ۳۵۔۳۹

۳۔ Maryam Jameela,Islam Versus The West, Delhi, Markazi Maktaba Islami, 1981,P.P 172-173

۴۔ مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش، ص ۵۷۔

۵۔ الدکتور احمد ابوحاقۃ ،الالتزم فی الشعر العربی ،بیروت، دار العلم للملایین، ۱۹۷۹ء، ص ۱۶۴۔

۶۔ الدکتور محمد محمد حسین ،الاتجاهات الوطنية فی الادب المعاصر،

الجزء الأوّل ،بیروت، دار النهضته العربيّة، ۱۳۹۲ھ، ص ۱۱۱۔۱۱۳۔

Islam Versus The West,P.172

Edward W.Said,Orientalism,England,Penguin 1995,PP.14-15.Books,

۷۔ شوقی شعرہ الاسلامی، ص ۳۵

Islam Versus The West,P.172

۸۔ Ibid,173

۹۔ Lowell Thomas,With Lawrence in Arabia, London,Huchinson Co.PP.46-315

الالتزام فی الشعر العربی ،ص ۱۶۴ . ۱۹۹ .

زین، نور الدین زین،الصراع الدولی فی ،الشرق الأوسط وولادة دَوْلَتَیْ سوریا ولبنان ،بیروت، دار النهار، ۱۹۷۱ء ص ۶۰۔۶۱

۱۰۔ With Lawrence in Arabia.P.51

المنجدفی اللغۃو الأعلام، بیروت، دار المشرق، ۱۹۷۳ء، ص۶۱۵۔

الالتزم فی الشعر العربی ، ص۱۶۴۔۱۶۵۔

۱۱۔ Ismat Mahdi,Modern Arabic Literature,(1900-1967),

Da'iratul-Ma-arif,1983,P.4.

"Sykes-Picot Agreement," The Oxford Dictionary of 20Th

University Press,1992,

PP.452-453.

الالتزام فی الشعر العربی، ص۱۶۵۔

الصراع الدولی فی الشرق الأوسط، ص۶۸۔

۱۲۔ ایضاً، ص۷۱۔

الالتزام فی الشعر العربی، ص۱۶۵۔

۱۳۔ الصراع الدولی فی الشرق الاوسط ، ص۷۵۔

۱۴۔ محمد یوسف کوکن، أعلام النثرو الشعرفی العصر العربی الحدیث، ج۔۱، مدراس،

حافظ ہاوس، ۱۹۸۰ء، ص۴۔۵۔

(۱۹۰۰۔۱۹۶۷)

Modern Arabic Literature,P.5.

۱۵۔ المنجدفی الأعلام ، ص۲۳۷۔۲۳۸۔

۱۶۔ ایضاً، ص۴۵۰۔

۱۷۔ With Lawrence in Arabia.P.315

Modern Arabic Literature.(1900-1967)PP.4-5.

۱۸۔ مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش، ص۵۹۔۷۳۔

۱۹۔ ایضاً،ص۸۴۔

۲۰۔ المنجد فی الأعلام،ص۵۱۷۔

۲۱۔ اعلام النشر و الشعر فی العصر العربی الحدیث ،ج ۔ی، ص۱۱۔

R.A. Nicholson,A literary History of the Arabes,Delhi Adam Publishers,1994,p.p.568-569.

عمر الد سوقی، فی الأدب الحدیث ،ا لجزء الأول،القاهرة، دار الفکر العربی، ۱۹۷۰ء،ص۱۵۔

الدکتور شوقی صنیف ،الأدب العربی المعاصر فی مصر ،ص۱۶۔

۲۲۔ ایضاً،ص۱۶۔۱۷۔

۲۳۔ المنجد فی الأعلام ،ص۸۹۔

۲۴۔ ڈاکٹر فرمان فتحپوری، اقبال سب کے لئے ،دہلی ،ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس،۲۰۱۲ء،ص۱۔

۲۵۔ پروفیسر سلیم چشتی ،شرح جاوید نامہ، حصہ دوم، نئی دہلی ، اعتقاد پبلشنگ ہاوس،۱۹۹۳ء، ص۱۸۹۔۱۹۶۔

۲۶۔ اقبال سب کے لئے ،ص۱۔۲۔

شرح جاوید نامہ، حصہ دوم،ص۱۹۶۔۲۱۱۔

مزید تفصیل کے لئے

کلیات اقبالؒ (فارسی)، لاہور، شیخ غلام علی اینڈ سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ ،پبلشرز ۱۹۹۔ سرکلر روڈ، چوک انارکلی ۱۹۷۲ء ص۷۲۹۔۷۳۵۔

☆☆☆☆

﴿باب سوم﴾

نویدِ صبح

نویدِ صبح

ان پے درپے شکستوں کا جو اثر امت مسلمہ پر ہوا وہ ناگیز یر تھا۔[1] صلیبی جنگوں سے اہل مغرب کی آنکھوں پر جو پردہ پڑا تھا اب وہ چھٹ گیا۔ استعماری طاقتوں نے مسلمانوں کے فقر و جہل کو بھانپ لیا۔ انہوں نے بھی استعماریوں کو سامنے دیکھ کر اپنی کمزوریوں اور نادانیوں کو محسوس کرنا شروع کیا۔ کیونکہ اب یورپیوں نے امت مسلمہ کو علمی، اقتصادی، سیاسی اور حربی لحاظ سے پچھاڑ دیا تھا اور وہ ان کی طرف باندازِ تمسخر دیکھ رہے تھے۔[2]

اس ہلاکت خیز تاریکی میں جبکہ مسلمان خوابِ غفلت میں تھے، ایک نور کی کرن پھوٹی اور تب تک فروزاں رہی جب تک نہ وہ چونک پڑے، اپنی موندی ہوئی آنکھوں کو واکیا تو دیکھا کہ امت کے بے لوث مصلحین (Rerformers) اور دانشور انہیں جھنجوڑ رہے ہیں اور اجنبیوں کے خطرات سے انہیں متنبہ کر رہے ہیں۔ کیونکہ وہ دیکھ رہے تھے کہ استعماری زنجیروں میں جکڑے ہوئے مسلمان اب رسوا کن پستی کے خوگر ہو گئے ہیں، کثیف تاریکی میں بے سود اپنے ہاتھ پیر مار رہے ہیں اور آرزوؤں پر قناعت کرتے ہیں۔ اپنے اسلاف کے ساتھ رشتہ جوڑتے ہیں جب کہ وہ ان سے برملا کہتے ہیں لَسْتُمْ مِنَّا (آپ ہم میں سے نہیں ہیں)۔ وہ بڑی چرب زبانی سے دین کی باتیں کرتے ہیں جبکہ دین ان سے برأت کا مظاہرہ کر رہا ہے۔

اس نازک اور پیچیدہ صورتحال سے نمٹنے کے لئے مختلف اسلامی ممالک میں مصلحین امت کا یہ حساس اور دردمند قافلۂ سخت جان میدان میں آیا۔ یہ حضرات زہد وورع میں یکتائے روزگار، علم وفضل میں زمانے کے نامدار، خلوص ووفا سے سرشار

اور درد و کرب سے بے قرار تھے۔ ان پاک نفوس نے اس تہذیبی تصادم میں منفی رویہ سے دامن بچاتے ہوئے، اس تہذیبی یلغار کے سامنے شکست خوردگی اور مکمل سپردگی سے گریز کرتے ہوئے، حقائق و واقعات کا دوراندیشی اور صحیح دینی بصیرت کے ساتھ سامنا کیا۔

یہ اصلاحی تحریک جو ہر دین پر مشتمل تھی۔ اس کے پیش نظر مسلم ممالک کی وحدت تھی۔ اس نے امّت کے بکھرے دانوں کو ایک ہی تسبیح میں پرونے کے لئے تگ ودو کی۔ اس عظیم تر مقصد کے حصول کے لئے ان مصلحین نے قرآن و حدیث اور نبی اکرم ﷺ کے اسوۂ حسنہ کا نسخہ کیمیا پیش کیا۔ استحکام خلافت اور ربطِ مرکز کی اہمیت و افادیت کو اجاگر کیا، ایک ہمہ گیر تحریک ہونے کے ناطے امّت کے سیاسی، اجتماعی، اقتصادی اور علمی موضوعات کو بھی زیر بحث لایا۔ ایک ایسے نظام تعلیم کو عام کرنے کی دعوت دی جو اسلام کے عقائد واصول اور عصرِ جدید کے تغیرات، دونوں کے ساتھ ہم آہنگ ہو اور دونوں کے تقاضے پورے کرتا ہو۔ تا کہ اپنے اسلاف کی طرح دنیا کو عقل و شعور سے دیکھیں اور اس کی حکمتوں کو اخذ کر سکیں اس سے ان میں بلند ہمتی اور اولوالعزمی پیدا ہوگی اور وہ جرأت و ذہانت کے ساتھ مغربی استعماریت کا مقابلہ کر سکیں گے۔[۳] یوں جمیع مسلم ممالک میں بیداری کی ایک لہر دوڑی۔ ایک نئی تحریک کا آغاز ہوا۔ ادباء و مؤرخین نے اسے ''حرکتہ الجامعتہ الاسلامیتہ'' کے نام سے موسوم کیا اور مستشرقین نے اسے Pan.Islamic Mouement سے تعبیر کیا تو کبھی اس کا نام بنیاد پرستی (Fundamentalism) رکھ دیا۔

افغانی سے شوقی تک

سید جمال الدین افغانیؒ (۱۸۳۹۔۱۸۹۷) تحریک وحدتِ اسلامیہ کے زعیم تھے۔انہوں نے مبشر و نذیر کی حیثیت سے مختلف اسلامی ممالک کا سفر کیا۔ان کا کوئی مخصوص وطن نہیں تھا بلکہ تمام ہی اسلامی ممالک ان کے لئے وطن کی حیثیت رکھتے تھے۔سچ تو یہ ہے کہ اسلام ہی ان کا وطن تھا وہ کبھی مصر میں ہوتے تو کبھی ترکی میں۔کبھی افغانستان میں ہوتے تو کبھی ایران میں۔ہندوستان کی بھی بادیہ پیمائی کی ہے۔اگرچہ وہ افغانی تھے لیکن صرف افغانستان ان کا مطمحِ نظر نہ تھا۔دراصل وہ تمام اسلامی ممالک کو ایک ہی وحدت میں پرونا چاہتے تھے تاکہ وہ ناقابل تسخیر قوت بن کر مغربی استعماریت کا مقابلہ کرسکیں۔اسی سے مسلمانوں کی عزت رفتہ واپس لوٹ آئے گی جو انہیں عہد خلافت میں حاصل تھی۔[۲]

سید افغانیؒ سے متعلق مشہور مستشرق گب (Gibb) صاحب نے بھی ان ہی خیالات کا اظہار کیا ہے۔اس کے علاوہ انہیں معاصر و معروف اسلامی تحریکوں میں سید صاحب ہی کی روح اور ان ہی کا جوش و خروش نظر آیا ہے۔چنانچہ وہ اس سلسلے میں لکھتے ہیں:

" He was the founder and inspiration of pan:İslamic Movemen,which saught to unite all Muslim Peoples under the ottoman Caliphate; and though he failed in this,his supreme objective,his influence lives on in the more recent populer movement which Combine Islamic

Fundamentalism with an activist political programe," 5

"وہ (سید جمال الدین افغانیؒ) حرکۃ الجامعۃ الاسلامیۃ کے بانی اور روح رواں تھے، تمام امت مسلمہ کو عثمانی خلافت کے سائے تلے متحد کرنے کی تگ ودو کی، اگر چہ اس میں وہ ناکام رہے، مگر ان کا عظیم تر نصب العین اور ان کا اثر معروف معاصر تحریکوں میں زندہ و پائندہ ہے جو اسلامی بنیاد پرستی کو ایک فعّال سیاسی ضابطہ کے تحت تقویت فراہم کر رہا ہے"۔

سیّد افغانیؒ کے نزدیک مسلمان فطرتاً کسی طرح بھی انگریزوں سے کمزور نہیں ہیں بلکہ وہ اپنی نا اتفاقی، جہالت اور مطلوبہ دینی کردار کے فقدان کی وجہ سے کمزور ہو گئے ہیں۔ اسلئے نا اتفاقی کا علاج وحدتِ امت میں مضمر ہے۔ جہالت کا علاج عصری علوم وفنون کو کماحقہ، حاصل کرنے اور سیاسی، اجتماعی، اقتصادی اور فنی لحاظ سے انہیں اسلامی زندگی کے ساتھ تطبیق دینے سے ہوگا۔ دینی کردار کا فقدان مسلمانوں میں اس لئے ہے کہ وہ اسلام کی اخلاقی تعلیمات سے بے بہرہ ہو گئے ہیں۔ اس کا علاج فضائل دین کی طرف رجوع کرنے سے ہی ہوگا۔

سیّد افغانیؒ کی دعوت تین اساسی اصولوں کے گرد گردش کرتی ہے۔

(۱) وحدتِ امت، (۲) اسلامی تعلیمات کے ساتھ اعتصام (۳) اور اسلامی تہذیب کو اپنا کر اور فروغ دے کر یورپی تہذیب پر فتح حاصل کرنا۔ ۶

استاد احمد حسن زیات کے نزدیک سیّد افغانیؒ

''اس راہ میں جیل جانے کو ریاضت، جلاوطنی کو سیاحت
اور قتل ہو جانے کو شہادت خیال کرتے تھے۔'' ۷

مزید لکھتے ہیں کہ:

''یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ انہوں نے جتنی امکانی کوششیں اور تدبیریں ممکن تھیں سب ہی کر ڈالیں ہگر اس وقت عالم اسلام میں جو افتراق و انتشار تھا وہ اس حد سے بہت نکل چکا تھا کہ اسے متحد کر دیا جائے۔ استبدادی قوتیں ان علاقوں پر اس طرح مستولی ہو چکی تھیں کہ انہیں ہٹانا اور شکست دینا ناممکن ہو گیا تھا۔'' ۸

سیّد افغانی نے علوم متداولہ سے فراغت کے بعد پہلے ۱۸۵۷ء میں حج بیت اللہ کا فریضہ انجام دیا۔ واپس افغانستان تشریف لائے تو کچھ عرصہ بعد ناسازگار حالات کی بنا پر وہ ملک چھوڑنے پر مجبور ہو گئے۔ ہندوستان گئے تو وہاں انگریزوں نے رہنے نہ دیا۔ آستانہ تشریف لائے تو صدر اعظم نے اس کا پرتپاک استقبال کیا۔ لیکن یہاں بھی اصحاب ضلال نے ان کے خلاف سازشوں کے جال بچھائے تو یہ شعلہ مصر منتقل ہوا۔ یہاں ریاض پاشا نے آپ کا پرتپاک خیر مقد کیا۔ یہاں آپ کی غیر معمولی علمی، انتظامی اور انقلابی صلاحیتیں نکھر آئیں۔ خاص طور پر الأزھر میں آپ کا قیام غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے۔ یہاں آپ لیکچر دیتے، ذہین طلباء و اساتذہ کرام کے ساتھ تبادلہ خیال کرتے۔ موضوع بحث وہ تمام باتیں ہوتیں جن کا اس سے پہلے تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے۔ جن حضرات نے یہاں آپ سے فیض حاصل کیا ان میں سے زیادہ مشہور اور زیادہ اقرب شیخ محمد عبدہ، سعد زغلول، ابراہیم اللقانی، رشید رضا، امیر شکیب، عبد القادر مغربی اور ابراھیم الھلباوی ہیں۔ ہم نشینوں میں محمود سامی البارودی، ابراھیم المویلحی اور

ادیب اسحٰق خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ بہر حال جب ملک کا تمام علمی اور ادبی حلقہ سیّد افغانی کا ہم نوا ہو گیا اور ہر طرف سے ان کی آواز گونجنے لگی تو انگریز ان کے اثرورسوخ سے تنگ آ گئے اور انہوں نے خدیو کو اس بات پر آمادہ کر دیا کہ وہ انہیں مصر سے نکال دے۔ چنانچہ آٹھ سال بعد ۱۸۷۹ء کو انہیں مصر سے نکلنے کا سرکاری حکم دیا گیا۔

مصر سے آپ ہندوستان چلے آئے تو حیدر آباد میں انگریز سرکار نے آپ کو گرفتار کیا۔ قید میں آپ نے ردِ نیچریت پر ایک بلند پایہ مقالہ لکھا جس کا عربی ترجمہ آپ کے لائق و فائق شاگرد نے ''الرّد علی الدھریین'' (Refutation of Materialists) کے نام سے کیا۔

سیّد افغانی کو رہائی صرف اس شرط پر ملی کہ حیدر آباد سے نکل کر آپ کسی یورپی ملک میں ہی قیام فرمائیں گے۔ چنانچہ حیدر آباد سے آپ پیرس تشریف لے گئے اور وہاں تین سال قیام فرمایا۔ آپ نے اپنے شاگردِ رشید شیخ محمد عبدہ کو بھی پیرس بلایا۔ اور اپنا مشہور رسالہ ''العروۃ الوثقٰی'' جاری کیا۔

پہلا شمارہ ۱۳/مارچ ۱۸۸۴ء کو شائع ہوا اور آخری شمارہ ۱۷/اکتوبر ۱۸۸۴ء کو شائع ہوا۔ [9] اس کے کل ۱۸ شمارے منظر عام پر آئے۔ حکومت برطانیہ نے ہندوستان اور مصر میں اس کی درآمد ممنوع قرار دے دی۔ جن لوگوں کے پاس یہ رسالہ پہنچتا تھا ان کو تشدد کا نشانہ بنایا جاتا۔ اس رسالہ نے اپنے مختصر زمانۂ اشاعت میں عالمِ اسلام پر بڑے گہرے اثرات چھوڑے۔ کیونکہ یہ صرف ایک رسالہ نہیں بلکہ ایک تحریک تھی۔ اس کا مقصد امّت مسلمہ کو خوابِ غفلت سے بیدار کرنا، متحد کرنا، آنے والے خطرات سے آگاہ کرنا اور ان کے مقابلہ کے لئے تیار کرنا تھا۔

ناصر الدین قاچار شاہ ایران انہیں بہ اصرار تمام ایران لے گئے مگر مخالفوں کی ریشہ دوانیوں نے انہیں ایران کو خیر باد کہنے پر مجبور کر دیا۔ زارِ روس کی دعوت پر آپ سینٹ

پٹرز برگ تشریف لے گئے۔ مگر کچھ عرصہ بعد سرزمین روس بھی آپ کی متحمل نہ ہوسکی۔ آخر ۱۸۹۲ء میں سلطان عبدالحمید نے آپ کو قسطنطنیہ آنے کی دعوت دی۔ سیّد افغانی کے بعض مشوروں سے اختلاف کے باوجود خلیفہ عبدالحمید نے اس بہادر حکیم کو چار سال تک نہایت اعزاز واحترام سے اپنے پاس رکھا یہاں تک کہ ۹ رمارچ ۱۸۹۷ء کوانہوں نے داعئ اجل کو لبیک کہا۔[۱۰]

سیّد جمال الدین افغانیؒ کی سرگرمیاں عملاً سارے عالم اسلام اور ان مغربی ممالک میں بھی جاری رہیں جو مسلم ممالک سے سیاسی وابستگی رکھتے تھے۔ ان میں افغانستان، ایران، ترکی، مصر اور ہندوستان سے ان کا زیادہ ربط وتعلق رہا۔ اس تحریک نے مسلمانوں میں بیداری کی جولہر پیدا کی آج مراکو سے لیکر ہندوستان تک دنیائے اسلام پر اس کے آثار نظر آتے ہیں۔ اس تحریک نے ہمارے ادب کو بھی بے حد متاثر کیا۔ اس جدوجہد میں سیّد افغانی کو بذاتِ خود کوئی علمی اور تحقیقی کارنامہ انجام دینے کی فرصت نہ ملی۔ مگراس شعلہ نے بہت سے چراغ روشن کئے۔ پھر ان ہی چراغوں نے یہ کام انجام دینے کے لئے انتھک کوششیں کیں۔ ان ہی چراغوں میں سب سے زیادہ روشن چراغ، گوہرِ آبدار اور یکتائے روزگار شخصیت مصلحِ ازہر شیخ محمد عبدہ کی ہے۔

شیخ محمد عبدہ (۱۸۶۹ـ۱۹۰۵)

سیّد جمال الدین افغانیؒ نے آخری بار مصر سے رخصت ہوتے وقت مصری احباب ورفقاء اور معتقدین سے ۱۸۷۹ء میں اپنے اس شاگرد رشید کے متعلق فرمایا تھا:

"لقد ترکت لکم الشیخ ،عبدہ وکفی بہ لمصر عالما"

(میں نے آپ کے یہاں شیخ محمد عبدہ کو چھوڑا ہے جو ایک عالم ہونے کے ناتے مصر کے لئے کافی ہیں۔)[۱۱]

شیخ محمد عبدہ جب جامعۃ الازہر میں زیرِ تعلیم تھے (۱۸۶۶ـ۱۸۷۰ء) انہی دنوں سیّد افغانی مصر تشریف لائے اور ازہر شریف سیّد صاحب کی علمی سرگرمیوں کا خاص مستقر رہا۔ انہوں نے عبدہ کی توجہ ان جدید علوم کی طرف مبذول کردی جو مغرب میں پڑھائے جاتے ہیں اور جن کی بدولت مغرب دن دونی اور رات چوگنی ترقی کر رہا ہے۔ اس طرح سے سید افغانی نے اپنے شاگرد کے خیالات کو وسعت بخشی عبدہ نے بھی اپنے مشفق استاد کے روشن خیالات کو جذب کیا اور یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کرلی کہ عالمِ اسلام کی نشأۃ ثانیہ کے لئے تعلیم کی اصلاح از حد ضروری ہے اور اصلاح تعلیم ازہر کی اصلاح کے بغیر ناممکن ہے۔ کیونکہ ازہر عالمِ اسلام کا سب سے بڑا دینی اور ثقافتی مرکز ہے۔

جورجی زیدان نے اسی بات کو یوں بیان کیا ہے:

"کان یعتقد أنه اذا أصلح الأزھر فقد أصلح حال المسلمین۔"[۱۲]

(ان کا پختہ یقین تھا کہ ازہر کی اصلاح سے سارے مسلمانوں کی اصلاح ہو جائے گی۔)

تاریخ الاستاد میں شیخ محمد عبدہ کے شاگرد رشید علامہ رشید رضا نے اسی بات

کو مزید وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے:

''وکان یتمنی أن لو استطاع اصلاح الادارة والتعلیم فیه و وسع فی مناهجه حتی تشمل بعض العلوم الحدیثة وتقوی و جوه الشبه بینه وبین غیره من الجامعات الأوربیة''[۱۳]

(ان کی آرزو تھی کہ اگر اس ادارہ کے طور طریقوں کو بہتر بنایا جائے اور اس کے نصاب کو وسیع کر کے اس میں بعض علومِ جدیدہ کا بھی اضافہ کر دیا جائے جس سے ازھر یورپ کی جامعات (Universities) کے مانند ہو جاتا۔)

ان کا طبعی میلان تعلیم و تربیت کی طرف ہی تھا۔ اسلئے اپنے متعلق فرمایا ہے کہ:

''انما خلقت لکی أکون معلماً۔''[۱۴]

(میں معلّم بننے کے لئے ہی پیدا کیا گیا ہوں۔)

یہی وجہ ہے کہ جلا وطنی سے واپس آنے کے بعد انہوں نے اپنے استاد سے مختلف اور جداگانہ طریقہ کار اختیار کیا جبکہ دونوں کا نصب العین ایک تھا۔ اس تبدیلی میں ان تلخ تجربات کا اثر بھی رہا ہوگا جن سے وہ ایک طویل عرصہ تک اپنے مرشد سیّد افغانیؒ سے گزرے۔ اپنی زندگی کے آخری دس سال شیخ محمد عبدہ نے ازھر کو ایک مثالی اسلامی یونیورسٹی بنانے کے لئے صرف کئے تا کہ یہ امّتِ مسلمہ کے لئے منارۂ نور بن سکے۔ انہوں نے ازھر سے بڑی امیدیں وابستہ کی تھیں۔ وہ اسی سے تجدید احیائے دین کا کام لینا چاہتے تھے۔ وہ اسی سے تمام عالم اسلام کی اصلاح کا کام لینا چاہتے تھے۔ ناموافق حالات میں کچھ کامیابیاں بھی حاصل ہوئیں، کچھ ناکامیاں بھی اور کچھ تسامحات بھی۔ مگر یہ

ناکامیاں ایک صبح درخشاں کی تمہید بنیں۔۱۵

ایک بڑا کارنامہ:۔

شیخ محمد عبدہ عربی زبان کی احیاء اور خالص کلاسیکل معیار کے قیام کی ضرورت پر مسلسل زور دے رہے تھے۔ یہ کام انہوں نے خود اپنے خطبات وتقاریر اور مذاکرات کی زبان سے ازھر اور دوسرے مقامات پر انجام دیا۔ محکمۂ اوقاف سے گرانٹ حاصل کر کے ایک معلم مقرر کیا جو ازھر میں اس صحیح وخالص زبان کی تعلیم دیتا۱۶

چونکہ تمام مسلم بلاک سے طلباء حصول علم کے لئے ازھر آتے تھے۔ یہاں سے فیض یاب ہو کر وہ اپنے یہاں اسی خالص کلاسیکی زبان میں لکھتے اور پڑھاتے تھے۔ اس سے قرآن وحدیث کی زبان ہر مسلم خطے میں زندہ رہی۔ بڑے بڑے ادباء وشعراء نے اپنی علمی اور ادبی تخلیقات کے لئے اسی زبان کو اپنایا۔ اس طرح عربی زبان میں ہماری لسانی وحدت برقرار رہی۔ اگر چہ اقلیمیت (Regionalism) کے جادو نے عربوں کے درمیان پھوٹ ڈالی تھی۔ یہ شیخ محمد عبدہ کا بہت بڑا کارنامہ ہے کہ انہوں نے بروقت اور برمحل اس فتنہ کا تدارک کیا جو قرآن کریم کی زبان کو مسلمانوں کے لئے عام طور پر اور عربوں کے لئے خاص طور پر اجنبی بنانے کے لئے بپا کیا جارہا تھا۔ اسلئے حقیقت میں یہ کام شیخ نے خود نہیں کیا بلکہ اللہ نے یہ سعادت انہیں عنایت فرمائی۔۱۷

این سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

زبان وادب پران کا اثر:۔

احمد حسن زیادت اس سلسلے میں لکھتے ہیں کہ

”ان کے زمانہ میں عربی زبان پر عجمیت چھائی ہوئی تھی

اور وہ خستہ و بے جان ہو رہی تھی۔ انہوں نے اسے عجمیت
کے تسلط سے نجات دلانے اور از سر نو زندہ کرنے کے لئے
پوری جدوجہد کی۔ جب وہ ''الجریدۃ الرسمیۃ'' کے
ایڈیٹر تھے تو وہ بڑے غور سے رسالوں، اخباروں اور
دفتروں کی زبانوں کو تنقیدی نگاہ سے دیکھتے۔ اپنے رسالہ
میں انہوں نے مضامین کا ایک سلسلہ جاری کیا تھا جس
میں بھونڈے اسالیب اور غلط تراکیب پر تنقید ہوتی۔ غلط
تحریروں کے نمونے دیتے۔ پھر ان کی غلطی کے اسباب
بیان کرتے اور ساتھ ہی لکھنے والوں کی اصلاح و تربیت
کے لئے اس عربی کو صحیح اور فصیح عربی میں لکھ کر بتاتے
...... وہی تھے جنہوں نے ازھر میں ادب پڑھانے کی
طرح ڈالی۔ احیاء کتب عربیہ میں انہوں نے امام محمد محمود
شنقیطی سے مدد لی اور ازھر میں تدریسِ ادب کے لئے
ہمارے استاد سیّد بن علی مرصفی کا تعاون حاصل کیا۔'' ۱۸؎

ان کاوشوں سے شیخ محمد عبدہ نے عربی ادب کو ایک منفرد طرز نگارش سے روشناس کیا جو نہایت درجہ حسین و دل پذیر ہے اور تراثِ قدیم سے مربوط بھی۔ افقِ دین پر جو بدلیاں چھائی ہوئی تھیں اس سے وہ بھی کافور ہونے لگیں۔

محمود سامی بارودی

(۱۲۵۵ھ۔۱۳۲۲ھ)

عربی ادب کی نثر نگاری میں احیاء و تجدید کا جو کارنامہ شیخ محمد عبدہ نے انجام دیا

وہی کارنمایاں عربی شاعری میں محمود سامی بارودی نے انجام دیا۔ اپنی ممتاز و بے بدل شاعرانہ خدمات کی بنا پر انہیں ''رائد الشعر العصر الحدیث'' (جدید دور کی شاعری کا باوا آدم۔) کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔

احمد حسن زیات ان کے بارے میں رقمطراز ہیں:

''اگر امرؤالقیس کو شاعری کی تمہید اور اصلاح کا شرف حاصل ہے اور بشار کو شاعری کے ترقی دینے اور حسین بنانے میں فضلیت حاصل ہے تو یقیناً بارودی کے سر عربی شاعری کے احیاء و تجدید کا سہرا ہے...... بارودی نے ابن المعتز، ابو فراس، رضی طغرائی اور ان جیسے بلند پایہ شعراء کا کلام حفظ کرلیا تھا۔ وہ اس سے بڑی حد تک متاثر اور ان کے رنگ میں رنگ گیا تھا۔''[20]

مزید لکھتے ہیں کہ:

''یہی سبب ہے کہ جب آپ اس کی شاعری کا مطالعہ کریں گے تو آپ کو ایسا معلوم ہوگا کہ اس کی شاعری کے اردگرد ان قدیم بلند پایۂ شعراء کی روحیں منڈلا رہی ہیں۔''[21]

بات صرف عباسی دور کے عبقری شعراء کی نہیں بلکہ البارودی نے جاہلی دور سے لے کر عہدِ عباسی تک کے جمیع نابھین شعراء کے ساتھ ٹوٹے ہوئے رشتے کو ازسرِ نو جوڑا۔ یہ ان کا ایک غیر معمولی کارنامہ ہے۔

لیکن پھر بھی مصر کے بعض ادباء و شعراء نے عامیانہ بولی میں اپنے جذبات واحساسات کو بیان کرنے کی سعی کی۔ بعض یورپی ادباء کی کہانیوں اور دیومالائی

داستانوں کا بھی اسی عامیانہ بولی میں ترجمہ کیا۔مگر اس کے مضر اثرات کے بارے میں الدکتور شوقی ضیف تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''ولكن هذا الاتجاه لم ينجح في محيط الشعر و الشعراء ، لأنه من جهة يفقد ناتراثنا القديم و يقطع كل صلة و نسب بين حاضرنا وماضينا ،ومن جهة ثانية يفصلناعن لغة القرآن الكريم،وأيضا فانه يفصل الأمة المصرية عن الأمم العربية.'' [۲۲]

(لیکن یہ رجحان دبستانِ شعر و شاعری میں کامیاب نہ ہو سکا، کیونکہ ایک طرف ماضی و حال سے ہمارا رابطہ کٹ رہا تھا تو دوسری طرف قرآن کی زبان سے ہم دور ہو رہے تھے،اور مصری مسلمان اور دوسرے عرب مسلمانوں کے درمیان بھی ایک خلیج پیدا ہو رہی تھی۔)

ان حقائق کو مد نظر رکھتے ہوئے شیخ حسن مرصفی نے اپنی مشہور کتاب ''الوسيلة الأدبية'' کو ترتیب دیا۔یہ کتاب دو ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے۔اس میں عربی زبان، نحو، بلاغت اور عروض کے قواعد کو کلاسیکی مثالوں سے آراستہ و پیراستہ کر کے عصری انداز میں پیش کیا گیا ہے۔اس میں موقع و محل کی مناسبت سے جاہلی، اسلامی اور عباسی عہد کے لگ بھگ ہر بڑے شاعر کے عمدہ کلام سے استدلال کیا گیا ہے بارودی کے منجھے ہوئے اسلوب کی خوب داد دی ہے۔اس طرح سے شیخ موصوف نے شعراء کی ذہن سازی کی اور انہیں بارودی کے اس نئے شعری انداز بیان کے اخذ و قبول کے لئے آمادہ کیا۔[۲۳]

نئی نسل کے شعراء کو یہ انداز بیان بہت پسند آیا۔ چنانچہ انہوں نے اپنی اپنی استعداد کے مطابق اسے اپنایا۔ خاص طور پر امیر الشعراء احمد شوقی، شاعر النیل حافظ ابراہیم اور شاعر القطرین خلیل مطران نے شاعری کے اس اسلوب کو آنکھوں سے لگایا' دل میں بسایا اور اس حد تک اپنایا کہ انہیں باحثین شعروادب نے محافظین کے لقب سے یاد کیا۔ اس لئے کہ انہوں نے قدیم ادبی شہ پاروں کا تحفظ کیا اور تراث قدیم کے ساتھ رشتہ مضبوط کیا۔ صرف اسی پر بس نہیں کیا بلکہ ادب عربی کے فصیح و بلیغ اور منفرد اسلوب کی حدود میں رہ کر ابتکار وتجدید کی کامیاب کوششیں کیں۔ مگر ان میں شوقی کا اسلوب حافظ ومطران دونوں سے ارفع واعلیٰ ہے۔ عربی زبان وادب کے معروف باحث وناقد شوقی ضیف بھی اسی بات کے قائل ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

''أما شوقی فکان اکثر الثلاثة ارتفاعاً فی اسالیبه''

(ان تینوں میں شوقی (احمد شوقی) اپنے اسلوب میں بلندی کے لحاظ سے اعلیٰ وارفع ہیں)

دینی حمیت وغیرت بارودی کو وراثت میں ملی تھی۔ اس لئے اسلامی ثقافت کے ازحد دلدادہ تھے۔ نبی اکرم ﷺ کی ذاتِ اقدس سے ان کی والہانہ عقیدت ومحبت کا اندازہ ان کے مشہور مدحیہ قصیدہ ''کشف الغمّہ فی مدح سیّدالأمّة'' سے کیا جاسکتا ہے۔ یہ قصیدہ ۴۴۷ ابیات پر مشتمل ہے۔ اسے امام بوصیریؒ کے ''قصیدة بردة'' کی زمین میں لکھا گیا ہے اور اسی کے ردیف وقافیہ کا تتبع گیا ہے۔ ۲۵

ہمارے زیر بحث شاعر امیر الشعراء احمد شوقی نے بھی اسی نہج پر دوسو پانچ اشعار پر مشتمل ایک قصیدة لکھا ہے اور اس کا نام ''نهج البردة'' رکھا ہے۔ ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی اس قصیدہ کے بارے میں لکھتے ہیں:

''شوقی کا قصیدہ الفاظ وترکیب اور شعری محاسن کے لحاظ

سے واقعی عربی زبان کے لئے حجت ہے۔"۲۶

یہاں اگر ہم جامع ازھر کا ذکر نہ کریں اور اس کی خوبیوں کا اعتراف نہ کریں تو بڑی ناانصافی ہوگی۔

سیّد افغانی کے تلمیذِ رشید شیخ محمد عبدہ ازھر کے ہی گل سرسبد ہیں۔ ۲۷ اور بارودی کی شاعری کے استاد شیخ حسن المرصفی بھی ازھری ہیں۔ ۲۸ ان کی کتاب 'الوسیلتہ الأدبیة' ۲۹ کی اہمیت وافادیت کسی صاحب نظر سے پوشیدہ نہیں۔ پھر شوقی کے شاعرانہ میلان کو جس استاد نے جلا بخشی وہ بھی ایک ازھری عالم شیخ البسیونی ہیں۔ بعض اساتذہ نے تو شوقی کو "بسیونی کا پھل" (ثمرة البسیونی) قرار دیا ہے اور شوقی نے اس کا اعتراف بھی کیا ہے۔ ۳۰ یوں جامع ازہر سے وابستہ یہ کارواں ایک ہی سلسلة الذھب کی بیش بہا کڑیاں ہیں۔

افغانیؒ سے اقبالؒ تک

سیّد جمال الدین افغانیؒ نے ۱۸۵۷ء میں فریضہ حج ادا کیا اور افغانستان واپس لوٹے۔ ناموافق صورتحال کی وجہ سے انہیں ۱۸۶۹ء میں افغانستان کو خیر باد کہنا پڑا۔ وہ ہندوستان چلے آئے لیکن عوام وخواص میں ان کی مقبولیت کو دیکھ کر انگریز سرکار نے انہیں یہاں سے بھی نکل جانے کا حکم دیا۔ جاتے جاتے انہوں نے یہاں کے زعماء سے فرمایا:

> ''قسم ہے اس ذات کی جس نے غلبہ حق اور قیامِ عدل کا ایک بھید رکھا ہے، اگر تم میں سے لکھوکھا افراد صرف مکھیاں بن جائیں تو وہ اپنی بھنبھناہٹ اور بھنکار سے ہی انگریزوں کو ہندوستان سے نکال سکتے ہیں۔ اور اگر تمہاری یہ تعداد کچھوے بن کر برطانوی جزیروں میں پہنچ جائے تو ان جزیروں کو پاٹ کر میدان بنا ڈالے۔'' ۳۱

اس بیان سے اہلِ ہند کے مردہ اعصاب میں ہیجان برپا ہونے لگا۔

پھر جب سیّد افغانی نے اپنے شاگردِ رشید شیخ محمد عبدہ کے تعاون سے پیرس سے ''العروۃ الوثقی'' نکالنا شروع کر دیا تو اس جریدہ کی مقبولیت نے برطانوی سامراج کو بے چین کر دیا۔ چنانچہ انہوں نے مصر وہند میں اس کی درآمد پر پابندی عائد کر دی اور اس کے قارئین کو کافی ڈرایا اور دھمکایا جاتا تھا۔ ۳۲

شیخ محمد عبدہ نے ۱۸۸۸ء میں جلاوطنی سے واپس آنے کے بعد اپنی عمر کے آخری حصے تک (۱۹۰۵ء) خود کو جامع ازہر کی اصلاح کے لئے وقف کر دیا تھا۔ اس دوران علامہ شبلی نعمانیؒ ازہر تشریف لائے۔ وہ عبدہ سے اپنی ملاقات کا تذکرہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''میں اُن سے ملا تھا۔ دیر تک لطف کی صحبت رہی۔ ازہر کی ابتری تعلیم پر افسوس کرتے تھے۔ لیکن اس کے ساتھ نئی تعلیم کے بھی سخت شاکی تھے اور کہتے تھے کہ ''ھُوَ لاءِ اَضلَّ سبیلا۔ افسوس ہے کہ گورنمنٹ مصر نے ان کو عہدۂ قضا پر مامور کیا ہے۔ وہ سررشتہ تعلیم کے لئے زیادہ موزون تھے چنانچہ خود بھی اس کا افسوس کرتے تھے۔''۳۳ے

مذکورہ بالا حقائق سے ہم پر یہ بات بخوبی عیاں ہو جاتی ہے کہ سیّد افغانیؒ کی آراء وافکار کا پرتو جہاں ترکی و مصر پر پڑا تھا وہاں انہوں نے ہندوستان کو بھی اپنی لپیٹ میں لیا تھا۔

۱۸۵۷ء کے ہنگامہ میں جب ہندوستان میں مغلیہ سلطنت کا آخری چراغ گل ہوا اور انگریزی حکومت کے قدم اچھی طرح جم گئے تو ان کی مُسلم کش حکمتِ عملی اور زیادہ سخت ہو گئی۔ جس کی وجہ سے زخم خوردہ اور مضمحل مسلمانوں کے لئے بہت سے ایسے مشکلات اور مسائل پیدا ہو گئے جو فوری اور دوراندیشانہ توجہ کا تقاضا کرتے تھے۔ اس نازک صورتحال سے نمٹنے کے لئے مختلف قیادتیں اور اصلاحی و تعلیمی تحریکیں ابھر کر سامنے آئیں۔ ان میں دارالعلوم دیوبند، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور ندوۃ العلماء لکھنو سرفہرست ہیں۔

دارالعلوم دیوبند۔

اس عظیم اصلاحی اور تعلیمی تحریک کا آغاز ۱۲۸۳ھ مطابق ۱۸۶۶ء میں ہوا۔ اس کے سربراہ وبانی حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ تھے۔ شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ فرماتے ہیں کہ:۔

''حضرت الاستاذ (مولانا محمد قاسم نانوتویؒ) نے اس مدرسہ کو کیا درس و تدریس، تعلیم و تعلّم کے لئے قائم کیا تھا؟ مدرسہ میرے سامنے قائم ہوا۔ جہاں تک میں جانتا ہوں ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کی ناکامی کے بعد یہ ادارہ قائم کیا گیا کہ کوئی ایسا مرکز قائم کیا جائے جس کے زیر اثر لوگوں کو تیار کیا جائے۔'' ۳۴؎

مولانا ابوالحسن علی ندویؒ دارالعلوم دیوبند کے متعلق لکھتے ہیں:۔

''اس تحریک اور اس کے قائدین نے ہندوستانی مسلمانوں کے اندر دین کی محبت، شریعت کا احترام اور اس کے راستہ میں قربانی کی طاقت اور مغربی تہذیب کے مقابلہ میں زبردست استقامت و صلابت (جو کسی اور ایسے اسلامی ملک میں دیکھنے میں نہیں آئی جس کو مغربی تہذیب اور مغرب کے اقتدار سے واسطہ پڑا ہو۔) پیدا کردی، دیوبند اس رجحان کا علمبردار اور ہندوستان میں قدیم اسلامی ثقافت اور تہذیب و تربیت کا سب سے بڑا مرکز تھا۔'' ۳۵؎

یہاں اس بات کا ذکر کرنا بے جا نہ ہوگا کہ علامہ محمد اقبالؒ اور حضرت علامہ محمد انور شاہ لولابیؒ کے درمیان گہرے روابط تھے۔ باہم خط و کتابت بھی رہی ہے اور بالمشافہ پُر کیف ملاقاتیں بھی ہوئی ہیں جن میں مسائل حاضرہ پر گفتگو ہوتی تھی۔

حضرت علامہ محمد انور شاہؒ دارالعلوم دیوبند کے فیض یافتہ، عبقری عالم دین اور فن حدیث کے امام زمانہ تھے۔ موصوف ان دنوں دیوبند کے مدرسہ قاسم العلوم میں مدرّسِ

اوّل کے عہدے پر فائض تھے۔ ۳۶؎

سرسیّداحمدخان اورعلی گڑھ مسلم یونیورسٹی:۔

مولانا مملوک علی نانوتویؒ کے نام نامی سے کون اہل علم آگاہ نہیں۔ مرحوم دہلی کالج کے مدرّس تھے۔ جن بزرگوں نے ان سے تعلیم حاصل کی ان میں سرسیّد احمد خانؒ بانی علی گڑھ کالج اور مولانا محمد قاسم بانی، دارالعلوم دیوبند جیسے صاحب علم وفضل شامل ہیں۔ ۳۷؎

مولانا ابوالحسن علی ندوی، سرسیّد احمد خان کے متعلق لکھتے ہیں کہ:۔

> ''سرسیّد احمد خان نے آخری مغل سلطنت کا زوال (جو مسلمانوں کی عظیم حکومت کی ایک دھندلی اور پھیکی سی تصویر تھی) اور ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی ناکامی کو اپنی آنکھوں سے دیکھا، انہوں نے اس ہنریمت، اہلِ ہند کی دل شکستگی، ان کی عظیم جماعت کے مقابلہ میں مٹھی بھر غیر ملکیوں کی فتح کا مشاہدہ کیا، مسلمانوں کو اس کوشش کی جو بھاری قیمت ادا کرنی پڑی اس کو بھی دیکھا، وہ قوم جو کل اس ملک کی حاکم تھی، اس کی ذلت وپستی، بڑے بڑے خاندانوں اور گھرانوں کی فلاکت اور انگریزوں کی شان وشوکت (جو مسلمانوں کی عظمت رفتہ کے ملبہ پر قائم ہو رہی تھی) نیز ان کی حکومت اور ساحرانہ تہذیب کے مناظر بھی دیکھے، اس کے علاوہ ملازمت، رفاقت اور دوستی وتعارف کے ذریعہ ان کو انگریزوں سے طویل واسطہ پڑا تھا اور بہت قریب سے ان کی زندگی کے مطالعہ کا موقعہ ملا تھا، وہ ان کی ذہانت، قوت عمل اور ان کے

تمدن سے متاثر ہوئے۔ وہ ایک ذہین، نہایت ذکی الحس، سریع الانفعال اور دردمند قسم کے آدمی تھے، انہوں نے متوسط درجہ کی دینی تعلیم پائی تھی اور دینی علوم اور کتاب وسنت پر ان کی نظر گہری اور وسیع نہ تھی۔'' ۳۸

ایک محسن اور مصلح ہونے کے ناتے ہندوستان میں ان کا محبوب مشغلہ اصلاح معاشرہ اور اشاعت تعلیم تھا۔ چنانچہ اپنی ملازمت کے زمانے میں انہوں نے سب سے پہلے ۱۸۵۹ء میں مراد آباد میں ایک فارسی مدرسہ قائم کیا۔ ۳۹ پھر غازی پور میں ۱۸۶۳ء میں ایک سائنٹفک سوسائٹی کا قیام عمل میں لایا۔ ۴۰ اس کے بعد غازی پور میں ہی ۱۸۶۴ء میں ایک اسکول قائم کیا جس میں انگریزی پڑھائی جاتی تھی۔ ۴۱

اب تک سرسیدؒ اصلاح معاشرہ اور اشاعت تعلیم کے لئے جو کام کر رہے تھے اس میں مسلمانوں کے ساتھ ساتھ ہندو بھی شریک تھے اور دونوں فریق فائدہ اٹھا رہے تھے۔ لیکن سرسیدؒ کے قیام بنارس کے دوران میں بعض ایسے واقعات پیش آئے جنہوں نے سرسیدؒ کے زاویہ نگاہ میں بڑی تبدیلی پیدا کی اور ان کے خیالات بدل گئے۔ خواجہ الطاف حسین حالی کا بیان ہے کہ:۔

''۱۸۶۷ء میں بنارس کے بعض سربرآوردہ ہندوؤں کو یہ خیال پیدا ہوا کہ جہاں تک ممکن ہو تمام سرکاری عدالتوں میں سے اردو زبان اور فارسی خط کے موقوف کرانے میں کوشش کی جائے اور بجائے اس کے بھاشا زبان جاری ہو جو دیوناگری میں لکھی جائے۔

''سرسیدؒ کہتے تھے کہ یہ پہلا موقع تھا جبکہ مجھے یقین ہو گیا کہ اب ہندو مسلمانوں کا بطور ایک قوم کے ساتھ چلنا اور

دونوں کو ملا کر سب کے لئے ساتھ ساتھ کوشش کرنا محال

ہے۔''۴۲

سفر انگلستان

انگلستان جانے کے لئے سرسیّد کے سامنے جو مقاصد تھے اُن میں ایک بڑا مقصد سروِلیم میور کی کتاب ''لائف آف محمدؐ'' کا جواب لکھنا تھا۔ اس کے لئے بہت سی ایسی کتابوں اور نوشتوں کی ضرورت تھی جو ہندوستان میں نایاب تھیں اور صرف برٹش میوزیم یا انڈیا آفس کے کتب خانوں میں مل سکتی تھیں۔۴۳

''دوسرا بڑا مقصد انگلستان کے طریقہ تعلیم کو دیکھنا اور اس پر غور کرنا تھا۔''۴۴

''انگلستان میں باقی ''تمام'' اعزاز وامتیاز اور خاطر ومدارات ضمنی اور غیر متوقع امور تھے۔''۴۵

موصوف یکم اپریل ۱۸۶۹ء کو انگلستان روانہ ہوئے۔ ولیم میور کی کتاب کا جواب لکھنے کے لئے مواد جمع کیا۔ اور ''خطبات احمدیہ'' کے نام سے اس کا مدلّل جواب لکھا۔ انگلستان کے طریقہ تعلیم کا عینی مشاہدہ کرنے کے لئے کیمبرج یونیورسٹی کو خود جا کر دیکھا۔ اس کا تمام نقشہ ذہن نشین کرلیا۔ تعلیم کے مختلف طریقوں میں سے جو طریقہ ہندوستان کے مسلمانوں کی حالت کے مناسب سمجھا اس کو نگاہ میں رکھا۔ ۱۸۷۰ء کو واپس بنارس تشریف لائے۔۴۶

تہذیب الاخلاق

۲۴ دسمبر ۱۸۷۰ء کو تہذیب الاخلاق جاری کیا۔ جو نشیب و فراز کے مختلف مرحلوں سے گزرا۔ اس کے متعلق سرسیّد خود ہی رقمطراز ہیں:۔

''تہذیب الاخلاق کا نکالنا بھی ایک ولولہ تھا جس کا اصلی

مقصود قوم کو اس کی دینی اور دنیوی ابتر حالت کا جتلانا اور سوتوں کو جگانا بلکہ مردوں کو اٹھانا اور بند سڑے پانی میں تحریک کا پیدا کرنا تھا۔ یقین تھا کہ سڑے ہوئے پانی کو ہلانے سے زیادہ بدبو پھیلے گی مگر حرکت آجانے سے پھر خوشگوار ہو جانے کی توقع ہوتی تھی"۔ ۴۷

اس جریدہ نے اردو زبان کو سنجیدہ علمی و ادبی مضامین کا متحمل بنانے میں بھی اہم رول ادا کیا۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

تہذیب الاخلاق ہی کے ساتھ سرسید نے "کمیٹی خواستگار ترقی تعلیم مسلمانان" قائم کی۔ اس کمیٹی نے فیصلہ کیا کہ مسلمانوں کی اعلیٰ تعلیم کے لئے سعی و جہد کی جائے۔ چنانچہ پہلے علی گڑھ میں ۱۸۷۵ء میں 'ایم۔اے۔او' نامی ہائی اسکول کا افتتاح کیا گیا۔ ۸ جنوری ۱۸۷۷ء کو بڑے ہی تزک و احتمام کے ساتھ 'اینگلو اورینٹل کالج اہل اسلام' کا بنیادی پتھر رکھا گیا۔ ۴۸

خواجہ الطاف حسین حالؔی لکھتے ہیں:

"سرسیّد کا ارادہ یہی تھا کہ یونیورسٹی قائم کی جائے۔ اُن کو یقین تھا کہ جب تک موجودہ یونیورسٹیوں کی تعلیم سے قطع نظر نہ کی جائے گی اور مسلمانوں کی تعلیم کے لئے ان کی ضرورتوں کے موافق تعلیم و تربیت کا اپنے طور پر انتظام نہ کیا جائے گا، تب تک اصلی لیاقت قوم کے بچوں میں ہرگز پیدا نہ ہوگی۔ وہ چاہتے تھے کہ اس دارالعلوم

میں کیمبرج یونیورسٹی کے موافق فیلوسسٹم قائم کیا جائے
اور جو طالب علم فارغ التحصیل ہو جائے اس کو کسی خاص
علم میں جس سے وہ خاص مناسبت رکھتا ہو، مصروف
رہنے اور اس میں کمال حاصل کرنے کے لئے فیلوشپ
دی جایا کرے اور اس طرح ایک گروہ عالموں اور محققوں
کا قوم میں پیدا کیا جائے جو تمام قوم میں علم و کمال
پھیلانے کے لئے بمنزلہ آلہ کے ہو"۔۴۹

اگرچہ سر سیّد احمد خان اپنی حیات مستعار میں اس کالج کو یونیورسٹی نہ بنا سکے اور یہ حسرت لے کر ہی دنیا سے رخصت ہو گئے۔ مگر ہندی مسلمانوں کو یہ سبق پڑھا کر گئے:

نہ ہو تاب اڑنے کی جب آسماں تک
تو واں تک اڑیں ہو رسائی جہاں تک

یہ سر سیّد احمد خان کی دعاؤں کا اثر تھا یا ان کی حسن تدبیر یا خلوصِ نیت یا پھر ان تینوں خوبیوں کا کرشمہ کہ ان کی وفات کے بعد یہی مدرستہ العلوم (کالج) ایک ایسے بین الاقوامی دارالعلوم (International University) کی صورت اختیار کر لیتا ہے جہاں ادب و دینیات کے ساتھ ساتھ طبعی علوم (Natural Sciences) اور عمرانی علوم (Social Sciences) بھی پڑھائے جاتے ہیں۔ ان میں تخصص بھی کرایا جاتا ہے اور تحقیق بھی کرائی جاتی ہے۔ آج ساری دنیا میں یہ دارالعلوم علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کے نام سے مشہور ہے۔

آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس

ہندوستان کے کروڑوں مسلمانوں کی تمام تعلیمی ضروریات صرف ایک کالج سے

پوری نہیں ہو سکتی تھیں۔ اسلئے تمام صوبوں میں پھیلے ہوئے مسلمانوں کو بیدار کرنے کے لئے اوران میں تعلیم کا ذوق وشوق پیدا کرنے کے لئے ۱۸۸۶ء میں آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کی بنیاد ڈالی گئی۔ اس کی سرگرمیوں سے ہندی مسلمانوں میں ایک نئی زندگی کے آثار نمودار ہوئے۔ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے مختلف جلسوں میں سر سیّد احمد خان نے مسلمانوں کو انڈین نیشنل کانگریس کے سیاسی جھمیلوں سے دور رہنے اور حصول علم کی طرف مصروف رہنے پر زور دیا۔ ۵۰

سر سیّد کا دبستان ادب

مولانا ابوالکلام آزاد لکھتے ہیں:۔

''اگرچہ یہ حقیقت ہے کہ جدید اردو شاعری نے لاہور میں جنم لیا لیکن اسے اپنی نشوونما کے لئے علی گڑھ کی فضا راس آئی۔ نئے انداز اور جدید اسلوب کی نظمیں اسی شہر کے ادبی ماحول کی پیدا وار ہیں۔ پہلی بار محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس نے اس انداز کلام سے دنیا کو روشناس کرایا۔ اردو خطابت کی تربیت گاہ دراصل یہی کانفرنس ہے۔ اس کی آغوش میں وقت کے بلند پایہ ارباب ادب کی خطیبانہ صلاحیتیں پیدا ہوئیں''۔ ۵۱

مولانا شبلی نعمانی لکھتے ہیں:۔

''سر سیّد کے جس قدر کارنامے ہیں اگرچہ ان میں ریفارمیشن اور اصلاح کی حیثیت ہر جگہ نظر آتی ہے، لیکن جو چیزیں خصوصیت سے ان کی اصلاح کی بدولت ذرّہ سے آفتاب بن گئیں ان میں ایک اردو لٹریچر بھی ہے۔ سر سیّد ہی

> کی بدولت اردو اس قابل ہوئی کہ عشق و عاشقی کے دائرے سے نکل کر ملکی، سیاسی، اخلاقی، تاریخی ہر قسم کے مضامین اس زور اور اثر، وسعت و جامعیت، سادگی و صفائی سے ادا کرسکتی ہے کہ خود اس کے استاد یعنی فارسی زبان کو یہ بات آج تک نصیب نہیں''۔۵۲

کون نہیں جانتا کہ خواجہ الطاف حسین حالؔی جدید اردو شاعری کے امام تھے۔ مسدسِ حالؔی کی اہمیت و افادیت اور مقبولیت تو ایک مسلّمہ حقیقت ہے۔ مگر یہ مسدس سرسید ہی کے ایما پر لکھی گئی۔ ان کا کہنا ہے کہ ''بے شک میں اس کا محترک ہوا ہوں اور اس کو میں اپنے ان اعمال حسنہ میں سے سمجھتا ہوں کہ جب خدا پوچھے گا تو دنیا سے کیا لایا؟ میں کہوں گا کہ میں حالؔی سے مسدس لکھوالایا ہوں اور کچھ نہیں!''۵۳

سر سیّد کی دینی حمیت اور نبی اکرم ﷺ کی ذات اقدس سے ان کی کمال عقیدت و محبت کا ذرا سا اندازہ اس خط سے ہوتا ہے جو انہوں نے لندن سے نواب محسن الملک کو لکھا تھا۔ اپنے درد و کرب کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

> ''ان دنوں ذرا میرے دل کو سوزش ہے۔ ولیم میور صاحب نے جو کتاب آنحضرت ﷺ کے حالات میں لکھی ہے، اس کو میں دیکھ رہا ہوں۔ اس نے دل کو جلادیا۔ اس کی ناانصافیاں اور تعصبات کو دیکھ کر دل کباب ہو گیا اور مصمّم ارادہ کیا کہ انحضرت ﷺ کی سیرت میں جیسے کہ پہلے بھی ارادہ تھا، کتاب لکھ دی جائے۔ اگر تمام روپیہ خرچ اور میں فقیر، بھیک مانگنے کے لائق ہو جاؤں تو بلا سے قیامت میں تو یہ کہہ کر پکارا

جاؤں گا کہ اس فقیر، مسکین احمد کو جو اپنے دادا محمد ﷺ کے

نام پر فقیر ہو کر مر گیا، حاضر کرو۔

مارا ہمہ تمغہ، شاہنشاہی بس است!'' ۵۴؎

سیّد احمد خان کے اصلاحی، ادبی اور علمی کارنامے بہت ہیں انہوں نے غدر میں لٹے پٹے، افسردہ اور بکھرے ہوئے ہندی مسلمانوں کو متحد کیا، ان کی زندگی میں ایک نیا جوش اور ایک نیا ولولہ پیدا کیا۔ اس کام میں ملّت کے بہترین دماغوں اور قابل ترین فرزندوں نے ان کا ساتھ دیا۔ ان میں حالیؔ، محسن الملک، شبلی، نذیر احمد اور ذکاء اللہ بہت زیادہ معروف ہیں جو اس تحریک کے درخشندہ تارے کہلائے جاتے ہیں۔

مولانا شبلی نعمانی نے اپنی مشہور مثنوی ''صبح امید'' میں سر سیّد کی شخصیت اور اُس کے ملّی کارناموں کی بہترین آئینہ داری کی ہے۔ اس میں سر سیّد کی شکل وصورت کو بڑے دل نشین اشعار میں پیش کیا گیا ہے:

صورت سے عیاں جلال شاہی — چہرے پہ فروغ صبح گاہی

وہ ریشِ دراز کی سپیدی — چھٹکی ہوئی چاندنی سحر کی

پیری سے کمر میں اِک ذرا خم — توقیر کی صورت مجسّم

وہ ملک پہ جان دینے والا — وہ قوم کی ناؤ کھینچے والا

ان کے کارناموں کو سراہتے ہوئے کہا ہے:

باتوں میں اثر تھا کس بلا کا — اکبار جو رُخ پھر اہوا کا

امید کی بڑھ گئی تگ وتاز — اونچی ہوئی حوصلوں کی پرواز

خواہش کے بدل گئے ارادے — ہمت نے قدم بڑھائے آگے

وہ دوڑ چلے جو پابہ گلِ تھے — آندھی ہوئے جو فسردہ دل تھے ۵۵؎

اسی طرح اکبر الہ آبادی نے بھی آخر میں سرسیّد کی شخصی خوبیوں کا اعتراف کیا۔ چنانچہ ان کی وفات کے موقع پر جو اشعار کہے ان میں قلبی خلوص اور احترام کا جذبہ جھلکتا ہے:

ہماری باتیں ہی باتیں ہیں سیّد کام کرتا ہے
نہ بھولو فرق جو ہے کہنے والے کرنے والے میں
کہے جو چاہے کوئی میں تو یہ کہتا ہوں اے اکبر
''خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں'' ۵۶

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ

''سرسیّد احمد خان کی طاقتور شخصیت کے اثر کا ہندوستان کی اسلامی سوسائٹی میں دائرہ بہت وسیع ہے انہوں نے ادب وزبان، طریق فکر و اسالیب بیان سب کو کم و بیش متاثر کیا، اور ایک ایسے ادبی وفکری دبستان کی بنیاد ڈالی جس کے اندر بڑی بڑی شخصیتیں پیدا ہوئیں''۔ ۵۵

ہم نے سیّد احمد خان کے چند کارناموں کے مثبت پہلو اجاگر کیے۔ بلاشبہ ان کے نقطۂ نظر کے بعض کمزور پہلوؤں کی طرف بھی علماء و محققین نے نشاندہی کی ہے۔ خاص طور پر ان کی تفسیر کے کئی تسامحات پر بھی تنقید کی گئی ہے۔ مگر جس دور اور جن حالات میں انہوں نے یہ کام کیے اور جو کارنامے انجام دئے اس لحاظ سے وہ بے مثال ہیں۔ ان پر لکھتے وقت ہمیں اُس دور اور اُن حالات کو مدنظر رکھنا چاہئے جس دور سے وہ گزرے اور جن حالات سے انہیں دوچار ہونا پڑا۔

سرسیّد احمد خان اور مفتی محمد عبدہٗ کے درمیان کئی پہلو قدرِ مشترک کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس لئے بعض اہلِ علم مفتی محمد عبدہ کو مصر کا سیّد احمد خان کہتے ہیں۔ اسی طرح

البارودی کی ''کشف الغمہ فی مدح سید الأمة'' اور الطاف حسین حالی کی ''مسدس'' کے درمیان بھی کئی مماثلتیں پائی جاتی ہیں۔ صرف اتنا ہی نہیں دونوں ادبی دبستانوں میں کئی طرح کی مشابہتیں پائی جاتی ہیں۔

احمد شوقی نے جس عزت و احترام سے محمد عبدہ کو یاد کیا ہے اقبال نے بھی اسی طرح سید احمد خان کی دل سے قدر دانی کی ہے سر سیّد کا جہاں کہیں علامہ کی تصانیف میں ذکر آیا ہے، ساتھ رحمۃ اللہ علیہ لکھا ہوا ہوتا ہے۔ جس طرح شوقی، البارودی کی شاعری سے متاثر ہیں اسی طرح اقبال بھی حالی سے از حد متاثر ہیں۔ ۵۸

خواجہ الطاف حسین حالی نے اس وقت اقبال کی حوصلہ افزائی فرمائی جبکہ وہ ابھی نوجوان شاعر تھے۔

> ''۱۹۰۴ء کا واقعہ ہے کہ انجمن حمایت اسلام لاہور کا انیسواں سالانہ اجلاس یکم اپریل سے ۱۳ اپریل تک اسلامیہ کالج کے وسیع صحن میں منعقد ہوا۔ اس میں مولانا حالی، ڈپٹی نذیر احمد، مرزا ارشد گورگانی، میاں محمد شفیع، شیخ عبدالقادر، میاں فضل حسین، مولانا ابوالکلام آزاد اور خواجہ حسن نظامی دہلوی جیسے اکابر شریک تھے۔ اقبال نے اپنی نظم ''تصویر درد'' پڑھ کر سنائی تو مولانا حالی نے ایک شعر پسند کر کے انجمن کو دس روپے کا نوٹ عطا فرمایا۔ نوجوان شاعر کی اس سے زیادہ حوصلہ افزائی کیا ہو سکتی تھی کہ خدائے سخن اس کے کلام کی داد دے''۔

جب مولانا حالی کے نظم پڑھنے کی باری آئی تو ضعفِ پیری کے سبب ان کی نحیف ونزار آواز سامعین تک نہ پہنچ سکی اور لوگ سننے کے شوق میں بے قرار ہو کر آگے بڑھنے

لگے۔ شیخ عبدالقادر نے موقع کی نزاکت دیکھ کر مجمع کو یہ کہہ کر خاموش کیا کہ آپ فی الحال مولانا کی زیارت کریں اور ان کی زبانِ مبارک سے تبرکاً جو کچھ سنا جا سکے سن لیں، بعد میں یہی نظم اقبال پڑھ کر آپ کو سنا دیں گے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اور اقبال نے بلند آواز سے نظم دوبارہ پڑھ کر مولانا کی بزرگی کی لاج رکھ لی۔ جب وہ مولانا کی نظم سنانے کھڑے ہوئے تو اوّل یہ رباعی فی البدیہ کہی، پھر مولانا کی نظم سنائی۔

مشہور زمانے میں ہے نام حالی
معمور مئے حق سے ہے جامِ حالی
میں کشورِ شعر کا نبی ہوں گویا
نازل ہے مرے لب پہ کلامِ حالی ۵۹

مولانا حالی کے کلام میں خوخلوص و محبت، درد و کرب اور سوز و گداز پایا جاتا ہے، اقبال اس سے کچھ زیادہ ہی متاثر تھے۔ چنانچہ اپنی علالت کے باوجود وہ مولانا کی صد سالہ برسی کے موقع پر ۲۶/ اکتوبر ۱۹۳۵ء کو پانی پت تشریف لائے۔ اجلاس میں شرکت فرمائی۔ مولانا مرحوم کی شان میں فارسی زبان میں اشعار کا ایک گلدستہ بھی ساتھ لائے تھے جو علالت کی وجہ سے اجلاس میں سنا نہ سکے۔ اس خراجِ عقیدت کے آخری دو شعر ملاحظہ فرمائیں۔

طوافِ مرقدِ حالی سزد اربابِ معنی را
نوای او بجانہا افگند شوری کہ می دانم
بیا تا فقر و شاہی درحضور او بہم سازم
تو بر خاکش گہر افشاں و من برگِ گل افشانم ۶۰

اکبرالٰہ آبادی

سیّد اکبر حسین اکبرالٰہ آبادی (۱۸۴۶ء-۱۹۲۱) اعلیٰ درجہ کے شاعر ہیں اور اپنے مزاحیہ کلام کی وجہ سے معروف ہیں۔ علامہ محمد اقبال کو ان سے بڑی عقیدت تھی چنانچہ ایک جگہ فرماتے ہیں:

"جنابِ مولانائے اکبرالٰہ آبادی، جنہیں موزوں طور پر لسان العصر کا خطاب دیا گیا ہے، اپنے بذلہ سنجانہ پیرایے میں ان قوتوں کی ماہیت کے احساس کو چھپائے ہوئے ہیں، جو آج کل کے مسلمانوں پر اپنا عمل کر رہی ہیں۔ ان کے کلام کے ظریفانہ لہجے پر نہ جایئے۔ ان کے شباب آور قہقہے ان کے آنسوؤں کے پردہ دار ہیں۔ وہ اپنے نہاں خانۂ صنعت میں اس وقت تک آپ کو داخل ہونے کی اجازت نہیں دیتے جب تک آپ ان کا مال خریدنے کے لئے ذوقِ سلیم کے دام اپنی جیب میں ڈال کر نہ آئیں"۔ ۶۱

دونوں کے درمیان خط و کتابت کا سلسلہ جاری تھا اور بعض اوقات بالمشافہ چند ملاقاتیں بھی ہوئی ہیں۔ چنانچہ اقبال ایک خط میں حضرت اکبر کو لکھتے ہیں:

"آپ کے خطوط، جو سب میرے پاس محفوظ ہیں، بار بار پڑھا کرتا ہوں اور تنہائی میں یہی کاغذ میرے ندیم ہوتے ہیں"۔ ۶۲

اصل میں "دونوں شاعر تھے، دونوں فلسفی تھے، دونوں کے قلوب اپنے عصر کے حالات سے متاثر تھے اور دونوں

کو اپنی ملّت اور اپنے وطن کی صلاح و فلاح اور ترقی و عروج عزیز تھی۔ ایک لسان العصر تھا، دوسرا ترجمانِ حقیقت۔ دونوں ایک دوسرے کو پہچانتے اور ایک دوسرے کی روح میں اتر گئے تھے۔ دونوں ایک دوسرے کے کلام اور فکر کی داد دیتے تھے۔''[۶۳]

اس تعلق خاص کا اندازہ ان دونوں بزرگوں کے خطوط اور ملاقاتوں سے لگایا جاسکتا ہے۔ محمد عبداللہ قریشی نے بھی اپنی معروف کتاب ''معاصرین اقبال کی نظر میں'' میں بعض ایسے خطوط اور ملاقاتوں کا حوالہ دیا ہے۔[۶۴]

تحریک ندوۃ العلماء

تحریک ندوۃ العلماء، دارالعلوم دیوبند اور مدرسۃ العلوم علی گڑھ کے بعد وجود میں آئی۔ ابوالحسن علی ندویؒ اس کے متعلق لکھتے ہیں:

''ندوۃ العلماء کی فکری تحریک (۱۳۱۱ھ مطابق ۱۸۹۳ء) جس کے بانی مولانا محمد علی مونگیری تھے اور جس کی رہنمائی ان کے بعد عرصہ تک مولانا شبلی اور ان کے نامور رفقاء نے کی اور اس کے دارالعلوم میں اس کی صلاحیت تھی کہ وہ اسلامی اور مغربی ثقافت اور علماء دین اور جدید طبقہ کے درمیان پل کا کام کر سکے اور ایک ایسا متوازن فکر تیار کر سکے جو قدیم و جدید دونوں کے محاسن کا جامع ہو اور اس مدرسہ فکر کے ذمہ داروں کے الفاظ میں ''اصول و مقاصد میں سخت اور بے لوچ، اور فروع اور وسائل میں وسیع

اور لچکدار ہو" ۶۵؎

اس کے بنیادی مقاصد حسب ذیل ہیں:

(۱) علوم اسلامیہ کے نصاب درس میں دور رس اور بنیادی اصلاحات اور نئے نصاب کی تیاری۔

(۲) ایسے علماء پیدا کرنا جو کتاب وسنت کے وسیع وعمیق علم کے ساتھ جدید خیالات سے بخوبی واقف اور زمانہ کے نبض شناس ہوں۔

(۳) اتحاد ملی اور اخوت اسلامی کے جذبات کو فروغ دینا۔

(۴) اسلامی تعلیمات کی اشاعت، بالخصوص برادرانِ وطن کو اس کی خوبیوں سے روشناس کرانا۔" ۶۶؎

اس مختصر سے تعارف سے ہم پر یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ تحریک ندوۃ العلماء اور علامہ محمد اقبال کی فکر کے درمیان کس قدر مماثلت پائی جاتی ہے۔ صرف اتنی سی بات نہیں ہے بلکہ خود علامہ شبلی نعمانی اقبال کے بڑے قدرداں تھے۔ پھر ندوۃ کے فاضل اور شبلی کے نامور شاگرد رشید سید سلیمان ندوی اور اقبال کے درمیان جو مراسم تھے وہ بذات خود ایک کھلی کتاب کی حیثیت رکھتے ہیں۔

محمد عبداللہ قریشی کا بیان ہے:

۱۹۱۱ء میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا وہ اجلاس بھی یادگار ہے جو مولانا شاہ سلیمان پھلواری کی صدارت میں دہلی میں منعقد ہوا اور جس میں اقبال کی گلپوشی کی رسم مولانا شبلی نے ادا کی۔ اس خوش گوار فریضے کو ادا کرتے ہوئے مولانا شبلی نے فرمایا:

> "یہ رسم کوئی معمولی رسم نہیں اور اس کو محض تفریح نہ تصور کرنا چاہئے۔ ہم مسلمانوں کا یہ شعار رہا ہے کہ ہم جس قدر قوم کی دی ہوئی عزت اور خطاب کی قدر کرتے رہے ہیں، اتنی کسی اور عزت کی شہرت ہمارے ناموں کے ساتھ

نہیں ہوئی۔ محقق طوسی وغیرہ کو ان کے زمانے کے سلاطین
نے بڑے بڑے خطابات دیئے لیکن آج سوائے کتابوں
کے اوراق کے کسی کی زبان پر نہ چڑھ سکے، لیکن قوم کی طرف
سے ''محقق'' کا جو خطاب دیا گیا، وہ آج تک زبان زد خاص
و عام ہے۔ جو عزت قوم کی طرف سے آج ڈاکٹر اقبال کو دی
جاتی ہے، وہ ان کے لئے بڑی عزت اور فخر کی بات ہے اور
حقیقت میں وہ اس کے مستحق ہیں۔'' ٦٧

مولانا شبلی ١٨ر نومبر ١٩١٤ء کو اس دار فانی سے رخصت ہوئے تو اقبال نے مرحوم کی لوح مزار کے لئے یہ تاریخی جملہ تجویز کیا:

''امام الهند والا نژاد شبلی طاب ثرا''

اس سے ١٣٣٢ھ ہجری ان کا سال وفات نکلتا ہے۔

ابھی مولانا شبلی کی رحلت کا صدمہ تازہ ہی تھا کہ ایک مہینہ اور بارہ دن کے وقفے کے بعد ٣١ر دسمبر ١٩١٤ء کو مولانا الطاف حسین حالی نے بھی داعی اجل کو لبیک کہا۔ اس پر اقبال نے ایک دل گداز قطعہ لکھا جس کا عنوان ''شبلی و حالی'' ہے اس کے آخری تین شعر حسب ذیل ہیں:

خاموش ہو گئے چمنستان کے راز دار
سرمایۂ گداز تھی جن کی نوائے درد
شبلی کو رو رہے تھے ابھی اہل گلستاں
حالی بھی ہو گیا سوئے فردوس رہ نورد
''اکنوں کرا دماغ کہ پرسد زباغباں
بلبل چہ گفت و گل چہ شنید و صبا چہ کرد'' ٦٨

سید سلیمان ندوی اور اقبالؔ

سید سلیمان ندوی علامہ شبلی نعمانی کے شاگرد رشید اور ندوۃ العلماء کے گل سرسبد ہیں۔ ان کا علمی مرتبہ اہلِ علم سے مخفی نہیں۔ ان کے دینی و علمی خدمات محتاجِ تعارف نہیں۔ موصوف کے ساتھ علامہ محمد اقبال کے غیر معمولی روابط و تعلقات تھے۔ ملت اسلامیہ کے ان دونوں بہی خواہوں کے درمیان خط و کتابت کا سلسلہ نومبر ۱۹۱۶ء سے اگست ۱۹۳۶ء تک پھیلا ہوا ہے۔ ۶۹ یہ خطوط ایک بیش بہا علمی سرمایہ کی حیثیت رکھتے ہیں، بلکہ گنجہائے گرانمایہ ہیں۔ اور کئی لحاظ سے ان کی بڑی اہمیت ہے۔

ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی لکھتے ہیں:

> ”علامہ اقبال کی جس قدر نظمیں یا تصنیفات معرض وجود میں آئیں ان سب پر علامہ سید سلیمان ندوی کا بے لاگ تبصرہ موجود ہے۔ سب سے پہلے ”معارف“ کے اپریل ۱۹۱۸ء کے شمارے میں اقبال کی مثنوی ”رموزِ بے خودی“ پر تبصرہ ہے“۔ ۷۰

اسی طرح سید سلیمان ندوی نے ہی اقبال کو فخر الدین امام رازیؒ کی کتاب ”مباحثِ مشرقیہ“ کو دیکھنے کا مشورہ دیا تھا۔ ۷۱

ان دونوں کی شخصی ملاقات ۱۹۲۷ء میں اس وقت ہوئی جب سید سلیمان ندوی انجمن حمایتِ اسلام کے جلسہ میں شرکت کے لئے لاہور تشریف لائے تھے۔ قیام لاہور کے دوران سید صاحب نے مختلف علمی اور ادبی محفلوں میں شرکت فرمائی۔ پھر ان مجالس کے متعلق ”معارف“ کے ’شذرات‘ میں لکھتے ہوئے اقبال کے بارے میں رقم طراز ہیں:

> ”ڈاکٹر اقبال ان تمام صحبتوں میں شمع محفل تھے۔ انہوں نے ”شمع اور شاعر“ لکھا ہے لیکن میں نے تو لاہور میں خود شاعر کو شمع دیکھا اور قدر شناسوں کو اس کا پروانہ

پایا۔ان کی صحبت لاہور کے نوجوانوں کی دماغی سطح کو بہت بلند کر رہی ہے۔ان کے فلسفیانہ نکات، عالمانہ افکار اور شاعرانہ خیالات ان کی آس پاس کی دنیا کو ہمیشہ متاثر رکھتے ہیں ۔''ان کی زمزمہ پردازیوں'' کا نیا مجموعہ ''زبورِعجم'' کے نام سے عنقریب سامعہ نواز ہونے والا ہے۔میں نے کہا کہ فلسفہ عجم کے دشمن کو مناسب بھی یہی تھا کہ عجم کے ہاتھ میں زبور دے کر ان کے خیالی فلسفے کو مزامیر داؤد کی دعاؤں سے بدل دے اور ان کے کانوں کو زبور کا ''پردہ'' رکھ کر قرآن کی نغمہ سنجیوں سے مانوس کر دے''۔۲ے

☆☆☆☆

حوالہ جات

۱۔ علال ألفاسیی،الحرکات الاستقلالیة فی المغرب العربی، القاهرة،مطبعة الرسالة، ۱۹۴۸ء،ص۱۰۵۔

۲۔ محمدمصطفی صفوت، الاحتلال الانجلیزی لمصروموقف دول الکبریٰ ازاء ه، القاهرة، دارالفکرالعربی،۱۹۵۲ء،ص۶۔

۳۔ قدری قلعجی ،محمد عبده،بیروت ،دارالعلم للملایین،۱۹۴۸ء،ص۱۱۔

۴۔ أحمد أمین، زعماء الاصلاح فی العصرالحدیث،القاهرة،مکتبة النهضة المصریة، ۱۹۴۸ء،ص۸۲۔

دکتور ماهرحسن فهمی ،شوقی شعره الاسلامی، القاهرة ،دارالمعارف بمصر ،۱۹۵۳ء،ص۴۰۔

۵۔ H.A.R.Gibb,Islam,London,Oxford University Press,.P.120

۶۔ الدکتوراحمدأبوحاقه ،الالتزام فی الشعر العربی، بیروت ،دارالعلم للملایین،۱۹۷۹ء،ص۱۰۹۔۱۱۰۔

۷۔ احمد حسن زیات ،تاریخ ادب عربی ، ترجمہ ،عبدالرحمٰن طاہر سورتی ،نئی دہلی ،قاری پبلیکیشنز ،بلبل خانہ ترکمان گیٹ ،۲۰۰۴ء ،ص ۵۵۸۔ بحوالہ خاطرات جمال الدین، ص۲۱۔

۸۔ ایضاً،ص ۵۵۸،بحوالہ خاطرات جمال الدین،ص۳۳۔

۹۔ محمد یوسف کوکن،أعلام النثروالشعرفی العصرالعربی الحدیث،مدراس،حافظ ہاوس،۱۹۸۰ء،ج۱،ص۲۴

۱۰۔ ڈاکٹر معین الدین عقیل، جمال الدین اور اقبال، ''صحیفہ'' اقبال نمبر حصہ اوّل، لاہور، مجلس ترقی ادب، جولائی۔اکتوبر ۱۹۷۷ء، ص ۲۰۴۔

ایضاً، ص ۱۹۵۔۲۲۶۔

مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیں۔

Maryam Jameela,Islam in Theory and Practice, Delhi,Taj Company,1983,PP.200.204.

احمد حسن زیات، تاریخ ادب عربی، ص ۵۵۷۔۵۶۱۔

ندوی، پروفیسر سید احتشام حسین، عصر حاضر کی اسلامی تحریکیں، علی گڑھ، انٹرنیشنل پرنٹنگ پریس، ۱۹۸۸ء، ص ۸۹۔۱۰۷۔

Emad Eldin shahin,Through Muslim Eyes,M.Rashid Rida and the West,International Institute of Islamic thought,Herndon, Virginia USA,1994,PP.6.7.

۱۱۔ دکتور محمد کامل الفقی، الأزهر وأثره فی النهضنة الأدبية الحديثة، الفجالة ۔ مکتبه نهضة مصر، ۱۹۶۵ء، ص ۲۷۱۔

۱۲۔ ایضاً، ص ۲۷۵۔ بحواله تراجم المشاهير الشرق لحورجی زیدان، ج ۱، ص ۸۶۔

۱۳۔ تاریخ الأستاذ الامام، السید رشید رضا مصری، القاهرة، مطبعته المنار بمصر، ۱۳۵۰ھ ۱۹۳۱ء
ج ۳، ۱۹۳۱، ص ۱۳۷۔

۱۴۔ دکتور محمد کامل الفقی، الأزهر وأثره فی النهضنة الأدبية الحديثة، ص ۲۷۱۔

۱۵۔ ندوی، ابوالحسن علی، مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش، لکھنو، مجلس تحقیقات ونشریاتِ اسلام، ۲۰۰۳ء، ص ۱۳۷۔۱۳۸۔

۱۶۔ تاریخ الاستاذ الامام، ج ۳، ص ۲۵۱۔۲۵۴۔

۱۷۔ عمر الدسوقی، نشأة النثر الحدیث وتطوره، القاهرة دار الفکر العربی،

۱۹۷۶ء، ص ۷۰۔۷۱۔

۱۸۔ استاذ احمد حسن زیات، تاریخ ادبِ عربی، ص ۵۶۳۔۵۶۴۔

مزید تفصیل کے لئے

أحمد أمین، زعماء الاصلاح فی العصر الحدیث، القاهرة، مکتبة النهضة المصریة،

۱۹۳۸ء، ص ۳۳۳۔۳۳۷۔

۱۹۔ احمد حسن زیات، تاریخ ادب عربی، ترجمہ عبدالرحمٰن سورتی، ص ۵۵۴۔

۲۰۔ ایضاً، ص ۵۵۴۔

۲۱۔ الدکتور شوقی ضیف، الأدب العربی المعاصر فی مصر، القاهرة،

دارالمعارف، ۱۹۹۵ء، ص ۴۴

ایضاً، ص ۴۳۔۴۴۔

مزید تفصیل کے لئے

الدکتور شوقی ضیف، فصول فی الشعر ونقده، القاهرة، دار المعارف، ۱۹۷۱ء،

ص ۲۸۴۔۲۸۶۔

۲۲۔ الأدب العربی المعاصر فی مصر، ص ۴۵۔

۲۳۔ ایضاً، ص ۴۶۔

فصول فی الشعر ونقده، ص ۲۸۶

۲۴ الأدب العربی المعاصر فی مصر، ص ۴۹۔

۲۵۔ محمود سامی البارودی، کشف الغمة فی مدح سید الأمة،

القاهرة، مطبعة الجریدة، ۱۳۲۷ھ

۲۶۔ ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی، عربی میں نعتیہ کلام، لکھنو مکتبہ اسلام، ۲۰۰۵ء،

ص ۲۷۵۔

۲۷۔ دکتور محمد کامل الفقی، الأزھر واثرہ فی النھضة الأدبیة الحدیثة
ص۲۷۰۔۲۷۱۔
۲۸۔ ایضاً،ص۵۴۷۔۵۵۰۔
۲۹۔ ایضاً،ص۵۵۷۔۵۵۸۔
۳۰۔ ایضاً،ص۵۵۰۔۵۵۷۔
۳۱۔ زیات، استاذ احمد حسن، تاریخ ادب عربی، ص۵۵۹۔
ندوی، پروفیسر سید احتشام احمد، عصر حاضر کی اسلامی تحریکیں، ص۹۱۔
چشتی، پروفیسر یوسف سلیم، شرح جاوید نامہ، ص۴۸۹
Islam in theory and Practice,P.200 Ibid.P.202.
۳۲۔ Ibid,P.202.
۳۳۔ نعمانی، علامہ شبلی، سفرنامہ روم، مصر وشام، دہلی، قومی پریس، ۱۳۱۹ء، ص۲۲۴۔۲۲۶۔
۳۴۔ مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش، ص۸۹۔
بحوالہ سوانح قاسمی، حصہ دوم، ص۲۲۶۔
شیخ اکرام، موج کوثر، دہلی، ادبی دنیا ۵۱۰ مٹیا محل، ۱۹۹۱ء، ص۲۰۶۔۲۱۱۔
۳۵۔ مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش، ص۹۰۔
۳۶۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیں۔
ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی، اقبال کی صحبت میں، مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۷۷ء، ص۱۲۳۔۱۳۴۔
۳۷۔ موجِ کوثر، ص۱۹۳۔
۳۸۔ مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش، ص۹۵۔۹۶۔
مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیں۔

حالیؔ، مولانا خواجہ الطاف حسینؒ، حیاتِ جاوید، دہلی، انجمن ترقی اردو، ۱۹۳۹ء۔

۳۹۔ ایضاً، ص ۱۳۰۔

۴۰۔ ایضاً، ص ۱۰۵۔

۴۱۔ ایضاً، ص ۱۰۷۔

۴۲۔ ایضاً، ص ۱۴۲۔

۴۳۔ حیات جاوید، ص ۱۳۰

۴۴۔ ایضاً، ص ۱۴۰

۴۵۔ ایضاً، ص ۱۳۹۔۱۴۰

۴۶۔ موج کوثر، ص ۸۶۔

۴۷۔ ایضا، ص ۸۷۔

مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیں۔

حیات جاوید، ص ۱۳۰۔۱۴۴۔

ایضاً، ص ۱۴۶۔۱۵۱۔

۴۸۔ موج کوثر، ص ۸۸۔

حیات جاوید، ص ۴۹۔

ایضاً، ص ۱۵۱۔۱۹۶۔

۴۹۔ ایضاً، ص ۱۷۳۔

۵۰۔ ایضاً، ص ۲۲۶۔۲۲۷۔

موج کوثر، ص ۹۵

ایضاً، ص ۱۰۲۔۱۰۳۔

۵۱۔ ایضاً،ص ۹۵۔۹۶۔

۵۲۔ ایضاً،ص ۱۴۰۔۱۴۱۔

۵۳۔ ایضاً،ص ۱۲۴۔

۵۴۔ ایضاً،ص ۱۰۹۔

مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیں۔

حیات جاوید،ص ۱۱۹۔۱۷۲۔

۵۵۔ موج کوثر،ص ۱۳۷۔

۵۶۔ ایضاً،ص ۲۱۶۔۲۱۷۔

مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیں۔

موج کوثر،ص ۲۱۲۔۲۲۰۔

۵۷۔ مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش،ص ۱۰۴۔۱۰۵۔

۵۸۔ محمد عبداللہ قریشی، معاصرین اقبال کی نظر میں، مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۷۷ء،ص ۸۶۔۹۱۔

ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی، اقبال کی صحبت میں،
مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۷۷ء،ص ۴۳۷۔۴۳۸۔

۵۹۔ معاصرین اقبال کی نظر میں،ص ۸۶۔۸۷۔

۶۰۔ اقبال کی صحبت میں،ص ۴۳۷۔۴۳۸۔

معاصرین اقبال کی نظر میں،ص ۹۰۔۹۱۔

مزید وضاحت کے لئے ملاحظہ فرمائیں۔

ڈاکٹر فرمان فتحپوری، اقبال سب کے لئے، دہلی ۶، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس، ص ۳۷۱۔۳۷۲۔

۶۱۔ معاصرین اقبال کی نظر میں، ص ۱۲۸۔
۶۲۔ ایضاً، ص ۱۲۹۔
مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیں۔
اقبال کی صحبت میں، ص ۲۲۹۔۲۳۰۔
۶۳۔ معاصرین اقبال کی نظر میں، ص ۱۳۱۔۱۳۲۔
۶۴۔ ایضاً، ص ۱۲۳۔۱۸۵۔
۶۵۔ مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش، ص ۹۰۔
۶۶۔ ندوی، مولوی محمد اسحاق جلیس، تاریخ ندوۃ العلماء، حصہ اوّل لکھنو، مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، 1983ء، ص ۵۶۔
۶۷۔ معاصرین اقبال کی نظر میں، ص ۱۶۹۔
۶۸۔ کلیات اقبال، ص ۱۶۹۔
نیز معاصرین اقبال کی نظر میں، ص ۸۹۔۹۰۔
۶۹۔ اقبال کی صحبت میں، ص ۲۰۲۔
۷۰۔ ایضاً، ص ۲۰۲۔
۷۱۔ ایضاً، ۲۰۵۔۲۰۶۔
۷۲۔ ایضاً، ۲۰۷۔۲۱۴۔

☆☆☆☆

﴿باب چہارم﴾

چند وہبی مماثلتیں

چند وہبی مماثلتیں

یہ بات غور طلب ہے کہ جس طرح شوقی اور اقبال کے کلام میں بعض پہلو قدرِ مشترک کی حیثیت رکھتے ہیں اسی طرح ان دونوں عبقری شاعروں کی زندگی کے مابین بعض وہبی مماثلتیں پائی جاتی ہیں۔ ان میں سے چند ایک کو ان کے تخلیقی عناصر میں شمار کیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

ان مماثلتوں میں سے ایک مماثلت یہ بھی ہے کہ ان دونوں شاعروں کی ولادت کی نویدِ جاں فزا ان کے والدین کو خواب میں سنائی گئی تھی۔ خود شوقی کا بیان ہے:

''ہم سے ہمارے زمانے کے ایک گرامی قدر بزرگ الشیخ علی اللیثی نے فرمایا ''ہم آپ کے والد سے ملے جبکہ آپ کی والدہ نے ابھی آپ کو جنا بھی نہ تھا۔ انہوں نے ہمیں ایک خواب سنایا جو انہوں نے رات میں دیکھا تھا۔ ہم نے انہیں اس کی تعبیر یہ بتائی کہ یقیناً آپ کو ایک غیر معمولی فرزند ارجمند عنایت کیا جائے گا''۔ [1]

اسی طرح اقبال کے بارے میں خلیفہ عبدالحکیم لکھتے ہیں:

''شیخ نور محمد صاحب (اقبال کے والدِ محترم) نے اقبال کی پیدائش کا ایک دل چسپ واقعہ مجھ سے بیان کیا۔ فرمانے لگے کہ اقبال ابھی ماں کے پیٹ میں تھا کہ میں نے ایک عجیب خواب دیکھا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک نہایت خوشنما پرندہ سطحِ زمین سے تھوڑی بلندی پر اڑ رہا ہے اور بہت سے لوگ ہاتھ اٹھا کر اور اچھل کر اُس کو پکڑنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ لیکن وہ کسی کی گرفت میں نہیں آیا۔ میں بھی ان تمام تماشائیوں میں کھڑا تھا اور خواہش مند تھا کہ غیر معمولی جمال کا یہ پرندہ میرے ہی ہاتھ آ جائے۔ وہ پرندہ یک بیک میرے آغوش میں آ گرا، میں بہت خوش ہوا اور دوسرے منہ تکتے رہ گئے۔

اس کے کچھ عرصے بعد مجھے اس خواب کی تعبیر القا ہوئی کہ پرندہ عالم روحانی میں میرا پیدا ہونے والا بچہ ہے جو صاحب اقبال ہوگا۔ اقبالؔ کے حصولِ کمال اور اس کی شہرت کے بعد مجھے اپنی تعبیر کے درست ہونے کا یقین ہوگیا"۔ ۲

شوقی ۱۸۶۹ء میں قاہرہ (مصر) میں پیدا ہوئے اور ۱۹۳۲ء میں وفات پائی۔ ۳ جبکہ اقبال ۱۸۷۷ء میں سیالکوٹ (پاکستان) میں پیدا ہوئے اور ۱۹۳۸ء میں داعئ اجل کو لبیک کہا۔ ۴ شوقی کو بچپن میں سب سے پہلے حصولِ علم کے لئے قاہرہ میں شیخ صالح کے مکتب میں داخلہ دلایا گیا۔ یہ مدرسہ قرآنیہ تھا۔ یہاں مروّجہ تعلیم نہیں دی جاتی تھی۔ اس کے بعد انہیں مروّجہ تعلیم کے لئے مختلف معروف مدرسوں میں پڑھنے کا موقع ملا۔ پھر جب سولہ سال کے ہو گئے تو اس نے کلیۃ الحقوق (Law College) میں داخلہ لیا۔ اسی کالج میں شوقی نے شعبۂ ترجمہ سے بھی وابستگی اختیار کی۔ یہاں تک کہ فارغ التحصیل ہو کر نکلے۔ ۵ جب شوقی لاکالج میں زیرِ تعلیم تھے تو انہیں اللہ تعالیٰ نے الأزھر کے پڑھے ہوئے، عربی زبان کے فصیح و بلیغ اور قادرالکلام شاعر الشیخ البسیونی ۶ کی سرپرستی سے نوازا۔ انہوں نے شوقی کی شاعرانہ صلاحیتوں کو جلا بخشی۔ یہاں تک کہ شوقی کو البسیونی کا ہی پھل کہا جاتا ہے۔ (شوقی ثمرۃ البسیونی) ۷

اقبال اپنی تعلیم کے متعلق خود فرماتے ہیں: "پنجاب میں ان دنوں علم و حکمت کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ میرے والد کی بڑی خواہش تھی کہ مجھے تعلیم دلوائیں۔ انہوں نے اوّل تو مجھے محلے کی مسجد میں بٹھا دیا۔ پھر شاہ صاحب کی خدمت میں بھیج دیا"۔ ۸

جس طرح شوقی کو شیخ البسیونی جیسے لائق و فائق استاد ملے۔ اسی طرح اقبال کو سید میر حسن جیسے روشن فکر معلّم کی بھرپور شفقتیں نصیب ہوئیں۔

اس مجسّم اخلاق استاد نے اقبال کو عربی، فارسی اور اردو ادبیات کے علاوہ علم و حکمت اور تصوف کی تعلیم سے بہرہ ور کیا۔ ان کے دل میں علوم اسلامیہ کے لئے شیفتگی پیدا کر دی۔ اقبال ان کا بے حد احترام کرتے تھے۔ ان کو سر سیّد اور علی گڑھ تحریک کا احساس سید میر حسن ہی کی وساطت سے ہوا تھا۔ ۹

دونوں شاعروں نے پہلے اپنے یہاں تعلیم حاصل کی پھر یورپ کی جامعات میں اعلیٰ تعلیم کے لئے داخلہ لیا۔

شوقی نے چار سال فرانس میں قانون کی تعلیم حاصل کی۔ دو سال مونبلیہ اور دو سال پیرس میں۔ اس میں ان کے استاد شیخ البسیونی کی شفقتیں ان کے شامل حال رہیں۔ اصل میں شیخ البسیونی نے مصر کے حکمران خدیو توفیق کے سامنے شوقی کی خوبیوں اور بے پناہ صلاحیتوں کو اس طرح پیش کیا کہ خدیو توفیق نے شوقی کو ۱۸۸۷ء میں خزانۂ عامرہ کے اخراجات پر حصولِ علم کے لئے پیرس بھیجا۔ [۱۰]

صالح جودت نے اسے خدیو توفیق کی ایک نمایاں خوبی اور سرزمینِ مصر پر ایک احسان سے یاد کیا ہے۔ کیونکہ جب احمد شوقی لا کالج (مدرسۃ الحقوق) سے فارغ التحصیل ہو کر نکلے تو انہیں چار سال کے لئے پیرس بھیجا گیا۔ انہیں ساتھ ہی یہ حکم بھی دیا گیا کہ وہ چار سال وہیں قیام کریں۔ چھٹیاں گزارنے کے لئے بھی مصر نہ آئیں بلکہ وہیں رہ کر مغربی آداب، لوگوں کی زندگی اور دیگر چیزوں کا مشاہدہ کریں۔ اس مقصد کے لئے پیرس، مونبلیہ اور لندن کی سیاحت کریں۔ [۱۱]

چنانچہ اس دوران انہیں فرانس کے علاوہ لندن میں بھی گھومنے پھرنے کا اچھا موقع ملا۔ فرانس میں شوقی فرصت کے اوقات میں وہاں کی علمی اور ادبی سرگرمیوں کا مشاہدہ کرتا اور فرانسیسی ڈرامے بھی دیکھتا تھا۔ یہیں اس نے یورپی ادب کا بغائر مطالعہ کیا اور اس کی بہت سی عمدہ چیزوں کو اپنی شاعری میں اس طرح اپنایا کہ وہ عربی ادب کا ایک حصہ بن گئیں۔ [۱۲]

اقبالؒ نے لاہور میں فلسفہ میں امتیاز کے ساتھ ایم۔ اے کیا پھر ۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ء تک کیمبرج، میونخ اور لندن میں حصول تعلیم میں مصروف رہے۔ جناب ابوالحسن علی ندوی اس سلسلے میں رقم طراز ہیں:

''وہ ۱۹۰۵ء میں کیمبرج میں داخل ہوئے اور فلسفہ و معاشیات کی امتیازی ڈگریاں پا کر تین سال تک لندن میں قیام پذیر رہے اور اس عرصے میں اسلامی موضوعات پر خطبات و مقالات کا سلسلہ بھی جاری رہا جس سے ان کہ شہرت و مقبولیت علمی حلقوں میں پھیلی، اسی مدت میں پروفیسر آرنالڈ کی غیر موجودگی میں لندن یونیورسٹی کے شعبۂ عربی میں تدریسی

فرائض بھی انجام دیئے اور میونخ جاکر فلسفہ میں ڈاکٹریٹ حاصل کی اور پھر لندن آکر قانون کا اعلیٰ امتحان پاس کر کے کامرس کالج لندن میں استاد ہو گئے، اور پھر سیاسیات و اقتصادیات میں امتیاز پیدا کرنے کے بعد ۱۹۰۸ء میں عازمِ وطن ہوئے، اقبال جب سسلی سے گزرے تو اسے اشک حسرت سے سیراب کرتے ہوئے گزرے:

رو لے اب دل کھول کر اے دیدۂ خونابہ بار
وہ نظر آتا ہے تہذیب حجازی کا مزار" ۱۳

ڈاکٹر جاوید اقبال نے "زندہ رود" میں اس موضوع پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ ۱۴

اس طرح امتِ مسلمہ کے ان دونوں روشن ستاروں نے مشرق و مغرب کے علمی سرچشموں سے فیض حاصل کیا۔ مگر اس میں ان دونوں کا اصل کارنامہ جو آبِ زر سے لکھنے کے لائق ہے وہ یہ ہے کہ انہوں نے قرآن اور صاحبِ قرآن صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنا رشتہ مضبوطی سے قائم رکھا اور اپنے ادبی شہہ پاروں میں قدیم صالح اور جدید نافع کی روش کو ترجیح دی۔

جب شوقی اور اقبال یورپ سے واپس لوٹے تو اپنے یہاں یکساں ماحول پایا۔ وہ یہ کہ سرزمینِ مصر پر برطانیہ براجمان تھا اور ہندوستان پر بھی برطانیہ ہی کی حکمرانی تھی۔ دونوں شاعروں نے یورپ کی آزادی کا عینی مشاہدہ کیا اور اپنی محکومی اور امت مسلمہ کی خستہ حالی کو بھی دیکھا۔ "اپنے ان قائدین و زعماء کے رویے پر افسوس کا اظہار کیا جو اسلامی قیادت کے دعویدار ہیں مگر حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم سے انہیں کوئی قلبی اور روحانی رابطہ نہیں۔ جو یورپ کے لئے شدِ رحال تو کرتے ہیں لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے نا آشنا ہیں، نہ کسی گہرے تعلق کا اظہار کرتے ہیں"۔ ۱۵

جب شریف مکہ کی فوجوں نے ۱۹۰۴ء میں برطانیہ کے اشارے پر حاجیوں کو تکلیف دی اور انہیں مجبور کیا تو شوقی نے اپنے مشہور قصیدہ "ضجیج الحجیج" میں خلیفۃ المسلمین سلطان عبدالحمید کو مخاطب کرتے ہوئے یہاں تک کہا کہ اے خلیفۃ المسلمین آپ شریف مکہ پر حملہ کیوں نہیں کرتے ہیں اور اس سے اللہ کے مہمانوں کے ساتھ اس توہین آمیز برتاو پر انتقام کیوں نہیں لیتے؟

۱۔ صَنَجَ الحِجَازُ و ضَجَّ البیتُ والحرمُ
واستصرخت ربها فی مکّةَ الأُمَمُ

۲۔ أُهین فیها ضیوفُ اللهِ و اضطُهِدوا
ان أنت لم تنتقِمْ فاللّٰهُ مُنتَقِمُ [16]

۱۔ حجاز چیخ پڑا، بیت اللہ نے نالہ وشیون کیا اور حرم شریف نے آہ وزاری کی۔ امت مسلمہ نے مکہ میں اپنے پروردگار سے مدد اور دادرسی کی خواستگاری کی۔

۲۔ کیونکہ اس میں اللہ کے مہمانوں کی توہین کی گئی اور وہ پامال کئے گئے۔ (اے خلیفۃ المسلمین) اگر آپ ان ظالموں کا انتقام نہیں لیں گے تو پھر اللہ ہی ان کا انتقام لے گا۔

اقبال، مصر و ہندوستان کے ایسے ہی مسلمان لیڈروں کے بارے میں فرماتے ہیں:۔

کل ایک شوریدہ خواب گاہِ نبیؐ پہ رو رو کے کہہ رہا تھا
کہ مصر و ہندوستان کے لیڈر بنائے ملت مٹا رہے ہیں

یہ زائران حریم مغرب، ہزار رہبر بنیں ہمارے
ہمیں بھلا ان سے واسطہ کیا جو تجھ سے نا آشنا رہے ہیں [17]

☆☆☆☆

حوالہ جات

۱۔ الدکتور أحمد محمد الحوفی، الاسلام فی شعر شوقی، القاھرۃ، المجلس الأعلی للشعون الاسلامیۃ، ۱۹۶۲ء، ص ۸۔

۲۔ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم، فکر اقبال، علی گڑھ، ایجوکیشنل بک ہاوس، ۲۰۰۲ء، ص ۱۸

۳۔ الدکتور شوقی ضیف، شوقی شاعر العصر الحدیث، القاھرۃ، دار المعارف، ۱۹۷۶ء ص ۹-۴۱۔

۴۔ ندوی، ابوالحسن علی، نقوش اقبال، لکھنو، مجلس تحقیقات و نشریات اسلام، ۲۰۰۷ء، ص ۳۷-۴۶

۵۔ فوزی عطوی، احمد شوقی أمیر الشعراء، بیروت۔ لبنان، الشرکۃ اللبنانیۃ للکتابۃ، ۱۹۶۹ء، ص ۱۳۔

۶۔ محمد کامل الفقی، الأزھر و أثرہ فی النھضۃ الأدبیۃ الحدیثۃ، الفجالۃ، مکتبۃ نھضۃ مصر، ۱۹۶۵ء، ص ۵۵۰-۵۵۳۔

۷۔ ایضاً ص ۵۵۳-۵۵۵۔

۸۔ ڈاکٹر جاوید اقبال، زندہ رود، لاہور، اقبال اکادمی پاکستان، ۲۰۰۸ء، ص ۷۵۔

۹۔ ایضاً ص ۸۳

۱۰۔ الأزھر و أثرہ فی النھضۃ الأدبیۃ الحدیثۃ، ص ۵۵۴۔

۱۱۔ احمد شوقی أمیر الشعراء، ص ۱۷۔

۱۲۔ شوقی شاعر العصر الحدیث، ص ۱۴-۱۵۔

مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیں

أحمد شوقی أمیر الشعراء، ص ۱۷-۲۱۔

۱۳۔نقوش اقبال، ص ۳۸

۱۴۔زندہ رود، ص ۱۲۹-۱۶۶

۱۵۔نقوش اقبال، ص ۳۹

۱۶۔أحمد شوقی أمیر الشعراء، ص ۳۰۳۔

۱۷۔نقوش اقبال، ص ۳۹۔

کلیات اقبالؒ (اردو) دہلی، مرکزی مکتبۂ اسلامی، ۱۹۹۳ء، ص ۱۳۴۔

☆☆☆☆

﴿باب پنجم﴾

شوقی اور اقبال کا قرآنی شعور

شوقی اور قرآن

امیر الشعرا احمد شوقی سب سے زیادہ قرآن کریم سے متاثر ہیں۔ان کی شاعری میں لغت اور اسلوب کے لحاظ سے قرآنِ کریم کی آیاتِ بینات کو مصدرِ اوّل کی حیثیت حاصل ہے اور ان کی دینی اتجاہات پر مشتمل شاعری پر قرآنِ کریم ہی کا پرتو ہے۔اس کے کئی وجوہ بیان کیے گئے ہیں۔

ا۔ جب شوقی چار سال کے ہو گئے تو انہیں حصولِ علم کے لئے شیخ صالح کے مکتب میں بھیجا گیا۔ یہ مدرسہ ایک قرآنی مدرسہ تھا۔اس طرح ان کے دل کے سادہ و شفاف ورق پر سب سے پہلے قرآنی آیات ہی رقم ہو گئیں۔ 1

۲۔ پھر مختلف مدارس میں سولہ سال تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد انہیں لا کالج میں قانون کی تعلیم کے حصول کے لئے داخل کرایا گیا۔اُسی کالج میں عربی ادب کے استاد شیخ بسیونی سے وہ متعارف ہو گئے۔ شیخ بسیونی کے بارے میں اس سے قبل عرض کیا گیا ہے کہ وہ ایک ازہری عالم تھے اور عربی زبان کے قادر الکلام شاعر۔شوقی کو ان ہی کا پروردہ کہا گیا ہے۔ 2

۳۔ شوقی، شیخ محمد عبدہ سے کافی متاثر ہیں۔ شیخ موصوف نے قرآن فہمی کے لئے جو نسخہ تجویز کیا ہے اُسے ان کے شاگردِ رشید تفسیر المنار کے مفسّر مرحوم سید محمد رشید رضا مصری نے یوں بیان فرمایا ہے:

''ہمارے شیخ ، الاستاد، الامام (شیخ محمد عبدہ) رحمہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے، بیشک قرآنِ کریم کا ایک خاص اسلوب ہے جسے وہی جانتے ہیں جو اس کے سمجھنے کے اہل ہوتے ہیں اور وہ (جانتے ہیں) جو قرآن کو اپنے دل و جگر میں سمو لیتے ہیں۔ رہے وہ لوگ جو مفردات الفاظ اور جملوں کی صورتیں پہچانتے ہیں، سو وہ اس سے دور ہیں۔

نیز یہ بھی فرمایا ہے کہ '' اللہ تعالیٰ کی کتاب کا فہم ذوقِ لغت، اس کی معرفت اور اس کے بلیغ کلام کی ممارست سے آتا ہے۔''

''جو قرآن کو اپنے دل وجگر میں سمو لیتے ہیں'' کو سمجھاتے ہوئے اپنی یہ مثال بیان کی کہ،
''جب میں قرآن سنتا ہوں یا اس کی تلاوت کرتا ہوں تو یہ گمان کرتا ہوں کہ میں وحی کے زمانے میں ہوں، اور یہ کہ اللہ کے رسول ﷺ اس کو سناتے ہیں جو کچھ ان پر نازل کیا جاتا ہے یا جبریل علیہ السلام اُسے لاکر آپ ﷺ کو سناتے ہیں''۔ ۳؎

۱۹۰۵ء میں جب شیخ محمد عبدہ نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا تو شوقی نے انہیں مفسّرِ قرآن کی حیثیت سے یاد کیا:

۱۔ مُفسِّرَ آيِ اللّٰهِ بِالأمسِ بَيْنَنَا
قُمِ اليَومَ فَسِّرْ لِلوَرَى آيَةَ الموتِ

۲۔ رُحِمْتَ، مَصِيرُ العَالَمِينَ كَمَا تَرَى
وَكُلُّ هَنَاءٍ أو عَزَاءٍ إلَى فَوْتِ

۳۔ هُوَ الدَّهرُ: مِيلادٌ، فَشُغْلٌ، فَمَأْتَم
فَذِكْرٌ كَمَا أَبْقَى الصَّدَى ذَاهِبُ الصَّوتِ ۴؎

ترجمہ
۱۔ کل تک ہمارے درمیان قرآن کی آیات کی تفسیر کرنے والے، آج ذرا اٹھیئے اور لوگوں کے لئے آیتِ موت کی تفسیر بیان کیجئے۔
۲۔ آپ پر (اللہ کی) رحمت سایہ فگن ہو، دنیا کا انجام یہی ہے جیسا کہ آپ دیکھ رہے ہیں اور ہر خوشی یا غم تو فنا کے گھاٹ ہی اتر جاتی ہے۔
۳۔ زمانہ کی ریت یہی ہے: پیدائش، پھر عملِ پیہم، پھر ماتم، پھر صرف تذکرہ۔ جیسے کہ آواز دینے والے کی صرف صدائے بازگشت ہی باقی رہتی ہے۔

توفیق الفلکی جو ادب عربی کے نامور ادیب اور باحث ہیں، احمد شوقی کے قرآن کریم کے ساتھ تعلقِ خاص کا ذکر بڑے ہی بلیغ پیرائے میں بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:
''ہاں بے شک جو شوقی کے قلائد (معروف قصائد) کو پڑھے گا .... اور اس کے ان ممتاز ڈراموں کا امعانِ نظر سے مطالعہ کرے گا جو فصیح اللّسان عربوں کے تراثِ قدیم کی احیاء کے لئے فتحِ مُبین کی حیثیت رکھتے ہیں، وہ اس کے سامنے بغیر کسی تردد کے اپنا سرِ تسلیم خم کرے گا جس نے

اپنی ساری زندگی اور اپنی عمرِ عزیز کے شب و روز لغتِ قرآن کے گنجہائے گرانمایہ کی تحقیق میں بسر کیے اور اپنے شباب و کہولت کو اس بحرِ معادن کی غواصی میں گزارا۔ پھر اس کے یگانہ جواہر ہائے آبدار کو اپنی شاعری میں اس طرح ڈھالا جس پر اجیالِ عرب فخر کرتے ہیں''۔ ۵

قرآنِ کریم کے ساتھ اس لگاؤ اور ذوق وشوق سے امیر الشعراء کی شاعری پر اس کا اثر جا بجا نظر آتا ہے۔ اس نے قرآن کریم کی آیات پر تضمینیں لکھی ہیں اور قرآنی قصص سے گہرا تاثر لیا ہے۔ پھر اس کی شعری لغت پر قرآن چھایا ہوا ہے۔

دکتورہ عبدالوھاب نے اپنی مشہور کتاب 'اسلامیات احمد شوقی' میں اکاسی (۸۱) صفحات پر مشتمل ایک باب لکھا ہے اور اس کے چار عناوین قائم کیے ہیں۔

☆تضمين آيات القرآن الكريم

☆التأثر بالقصص القرآني

☆صور دينية

☆المعجم الشعري ۶

لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو اس موضوع پر ایک ضخیم کتاب لکھنے کی ضرورت ہے جس کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں ہے۔ ہاں نمونتاً چند اشعار پیش کیے جاتے ہیں جو شوقی نے قرآن کریم کے متعلق کہے ہیں اور جو مذکورہ بالا تمام صفات کے حامل ہیں۔

مثلاً 'الهمزية النبوية' میں کہا ہے :۔

۱۔ الذِكرُ آيةُ ربِّكَ الكُبرىٰ التي
فيها لِباغي المعجزات غَناءُ

۲۔ صَدرُ البيانِ له اذا التَقتِ اللُّغى
و تقدّمَ البُلَغاءُ و الفُصَحاءُ

۳۔ نُسِختْ به التوراةُ وهي وَصِنيعةٌ
و تخلّفَ الإنجيلُ و هو ذكاءُ

۴۔ لَما تمشّى في (الحجاز) حكيمُهُ
فُضّتْ (عُكاظ) به، وَقام حِراءُ

۵۔ حَسَدُوا، فَقَالوا شَاعِر، أوْسَاحِر
وَمِنَ الحسودِ يكونُ الِاسْتِهزَاءُ ۷

ترجمہ: قرآن مجید آپ ﷺ کے پروردگار کی وہ بڑی نشانی ہے جو معجزات کے طالب کو دوسرے معجزات سے بے نیاز کر دیتا ہے۔
۲۔ جب مختلف زبانیں ایک جگہ جمع ہو جائیں اور فصیح و بلیغ مقرر آگے بڑھ کر بولیں تو اعلیٰ ترین بیان قرآن مجید کا ہی ہوگا۔ یعنی قرآن مجید کا بیان سب پر فائق ہے۔
۳۔ توراۃ اس سے منسوخ ہوگئی جبکہ وہ روشن تھی اور انجیل اسی سے ماند پڑ گئی جبکہ وہ آفتاب تھی۔
۴۔ جب اس قرآن مجید کا حکیم (یعنی رسول اللہ ﷺ) حجاز میں چلنے پھرنے لگا تو اس کے سامنے سوق عکاظ (کے ادبی میلے) ماند پڑ گئے اور غار حرا نے اس کی جگہ لے لی۔
۵۔ ان لوگوں نے حسد کیا اور (نبی اکرم ﷺ کے متعلق) کہا کہ یہ شاعر ہے یا جادوگر ہے۔ آخر حاسد آدمی کی طرف سے استہزا ہی ہوتا ہے۔
اپنے مشہور قصیدہ "نہج البردۃ" میں کہتے ہیں:

۱۔ جاءَ النبيُّونَ بِالآياتِ فَانصرمتْ
وجِئتَنا بحكيمٍ غيرِ مُنصرِمِ
۲۔ آياتُهُ كلما طَالَ المَدَى جُدُدٌ
يَزِينُهُنَّ جلالُ العِتقِ و القِدَمِ ۸

ترجمہ:
۱۔ انبیاء آیات (کتب سماوی و معجزات) لے کر آئے جو اب منسوخ ہو چکی ہیں۔ مگر آپ ﷺ ایسی حکمت والی کتاب لے کر آئے جو (معجزہ کبریٰ ہے) اور کبھی منسوخ ہونے والی نہیں ہے۔
۲۔ جوں جوں زمانہ طویل ہوتا ہے اس (حکمت والی کتاب) کے معجزات نئے ہیں۔ ان کے قدیم اور لایزال ہونے کا جلال انہیں آراستہ و پیراستہ کرتا ہے۔
شوقی کا قرآن کے ساتھ یہ تعلقِ خاص ان کی زندگی کے آخری دم تک قائم رہا۔ چنانچہ ان کے بیٹے، حسین شوقی کا بیان ہے کہ ۱۲؍اکتوبر ۱۹۳۲ء کو اپنی وفات کے دن اپنے کاتبِ خاص احمد عبدالوہاب کے ساتھ صرف دینی موضوعات پر گفتگو کرتے رہے اور کسی خاص وجہ سے ان سے قرآن کریم کی آیات توبہ و استغفار کے متعلق استفسار کرتے رہے۔ ۹

اقبال اور قرآن

اقبال اور قرآن

شاعر اسلام علامہ محمد اقبال کی تعلیم و تربیت پہلے مسجد میں درسِ قرآن سے ہوئی۔

اس سلسلے میں ڈاکٹر جاوید اقبال لکھتے ہیں:

''چنانچہ جس روز اقبال چار سال چار ماہ کی عمر کو پہنچے، شیخ نور محمد (والدِ اقبال) انہیں مسجد میں مولانا غلام حسن کے پاس لے گئے۔ اقبال نے اسی مسجد میں درسِ قرآن سے ابتدا کی۔ یہ تو وثوق سے نہیں کہا جا سکتا کہ انہوں نے کتنا عرصہ مولانا غلام حسن کی درسگاہ میں قرآن مجید پڑھا مگر یہ مدت تقریباً ایک سال کے لگ بھگ تھی''۔ [10]

اس کے بعد اقبال کی طالب علمانہ زندگی پر سید میر حسن کی بے پایاں شفقتوں کا سایہ رہا۔ موصوف ''ایک راسخ العقیدہ اور عبادت گزار مسلمان تھے۔ حافظ قرآن تھے اور قرآن مجید سے بے حد شغف رکھتے تھے''۔ [11]

مولانا سید سلیمان ندوی نے علامہ اقبال کی ابتدائی زندگی کے دو واقعے بیان کئے ہیں اور کہا ہے کہ ''میرے خیال میں یہ دونوں واقعے ان کی زندگی کے سارے کارناموں کی اصل بنیاد رکھتے تھے''۔ [12] ان میں سے ایک واقعہ اقبال اور قرآن کے ساتھ تعلق رکھتا ہے جو اقبال ہی کے الفاظ میں یوں بیان کیا گیا ہے:

''فرمایا، جب میں سیالکوٹ میں پڑھتا تھا تو صبح اٹھ کر روزانہ قرآن پاک کی تلاوت کرتا تھا۔ والد مرحوم اپنے اوراد و وظائف سے فرصت پا کر آتے اور مجھ کو دیکھ کر گزر جاتے۔ ایک دن صبح کو وہ میرے پاس سے گزرے تو مسکرا کر فرمایا، کہ کبھی فرصت ملی تو میں تم کو ایک بات بتاؤں گا۔ میں نے دو چار بار بتانے کا تقاضا کیا تو فرمایا، جب امتحان دے لو گے، تب۔ جب امتحان دے چکا اور لاہور سے گھر آیا تو فرمایا، جب پاس ہو جاؤ گے۔ جب پاس ہو گیا اور پوچھا، تو فرمایا، بتاؤں گا۔ ایک دن صبح کو حسبِ دستور قرآن کی تلاوت کر رہا تھا

تو وہ میرے پاس آگئے اور فرمایا، بیٹا، کہنا یہ تھا کہ جب تم قرآن پڑھو تو یہ سمجھو کہ قرآن تم ہی پر اتر رہا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ خود تم سے ہمکلام ہے۔ ڈاکٹر صاحب کہتے تھے کہ ان کا یہ فقرہ میرے دل میں اتر گیا اور اس کی لذت دل میں ابتک محسوس کرتا ہوں۔ یہ تھا وہ تخم جو اقبال کے دل میں بویا گیا اور جس کی تناور شاخیں پہنائے عالم میں اُن کے موزوں نالوں کی شکل میں پھیلی ہیں"۔ ۱۳؎ چنانچہ فرماتے ہیں:

ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزول کتاب
گرہ کشا ہے نہ رازی نہ صاحب کشاف ۱۴؎

مولانا عبدالسلام ندوی اقبال اور تلاوت قرآن سے متعلق لکھتے ہیں:

"ڈاکٹر صاحب کے انتقال کے بعد ان کی وصیّت کے مطابق اُن کی کتابیں اسلامیہ کالج لاہور کی لائبریری کو دیدی گئیں۔ ان ہی کتابوں میں ڈاکٹر صاحب کی تلاوت کا خاص قرآن از روئے وصیّت اُن کے لختِ جگر جاوید کو ملا، اور اس مصحف کے متعلق ڈاکٹر صاحب کے خاص خاص احباب کا بیان ہے کہ وہ بلا ناغہ صبح کے وقت اس کی تلاوت ایسے ذوق وشوق، ایسے دردو محبت اور ایسے سوز وگداز کے ساتھ کیا کرتے تھے، کہ آنسوؤں کا تار بندھ جاتا تھا، روتے جاتے تھے اور پڑھتے جاتے تھے، یہاں تک کہ کتاب عزیز کے ورق بھیگ جاتے، جب تلاوت ختم ہو جاتی تو اسے اٹھا کر دھوپ میں رکھ دیتے تاکہ صفحے خشک ہو جائیں، مدت العمر تک ان کا یہی دستور رہا، حتیٰ کہ زندگی کے آخری دنوں میں جب بیماری کا تسلّط ہو گیا، اور گلا خراب ہو جانے کی وجہ سے آواز میں پتی لگ گئی، تو ڈاکٹروں کے روکنے پر آپ کا یہ طریق تلاوت بھی چھوٹ گیا، جس کا انہیں نہایت رنج تھا"۔ ۱۵؎

آخر میں جب وہ آفتاب برسرِ کوہ تھے تو اپنی وفات سے پہلے قرآنِ کریم سے متعلق اپنے افکار قلم بند کرنا چاہتے تھے تو وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ "اس وقت اسلام کے نظام عمرانی کی تشریح و توضیح کی ضرورت ہے۔ اسلئے وہ چاہتے تھے کہ تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ کی طرح تشکیلِ جدید فقہ اسلامی پر، یہ دیکھ کر کہ قرآنِ پاک نے ان مسائل کی رہنمائی کس انداز میں کی ہے، قلم اٹھائیں"۔ ۱۶؎

لیکن صحت اور زندگی نے وفا نہ کی۔

''مظلوم صحیفہ''

فقیر سیّد وحید الدین لکھتے ہیں کہ بعض ایسے لوگ بھی مسلمانوں میں پائے جاتے ہیں، جو نہ عربی زبان و ادب میں خاطر خواہ استعداد رکھتے ہیں، نہ عرب قدیم کے علمی سرمایہ پر ان کی نگاہ ہے نہ قرآن کریم کو ٹھیک طور پر سمجھ سکتے ہیں مگر اپنی اس علمی تہی مایگی کے باوجود قرآنِ کریم کے ترجمہ اور تفسیر کی کوشش فرماتے ہیں، ڈاکٹر صاحب کو اس قسم کی باتوں سے بڑی اذیت ہوتی تھی۔ وہ اپنی متانت و سنجیدگی اور عالی ظرفی کے باوجود اس غم کو چھپا نہ سکے ایک بار فرما ہی دیا........ قرآن کریم اس اعتبار سے بڑا ہی ''مظلوم صحیفہ'' ہے کہ جسے دنیا میں اور کوئی کام نہیں ملتا، وہ اس کے ترجمہ وتفسیر میں مصروف ہو جاتا ہے۔

حالانکہ یہ نہایت ہی نازک اور محتاط ذمہ داری ہے''۔ [17]

قرآنِ مجید کے ساتھ اس وارفتگی شوق، بلاناغہ درد و محبت اور سوز و گداز کے ساتھ صبح سویرے اس کی تلاوت اور اس کی آیاتِ بیّنات پر تفکّر، تدبّر اور غور و خوض کرنے سے اس فنائی القرآن بیرسٹر اور مفکّر نے ہر شئی کو قرآن کی نظر سے دیکھا، ہر مسئلے پر قرآن ہی کی فکر سے غور کیا اور ہر گتھی کو قرآن ہی سے سلجھانے کی سعی وجہد کی۔ کس قدر خلوص اور عاجزی کے ساتھ رحمۃ اللعٰلمین ﷺ کے دربار میں عرض کرتے ہیں:

پردۂ ناموسِ فکرم چاک کن\
ایں خیاباں را ز خارم پاک کن\
روزِ محشر خوار و رسوا کن مرا\
بے نصیب از بوسۂ پا کن مرا [18]

ترجمہ:

۱۔ آپ میرے افکار کے ناموس کا پردہ چاک کر دیجئے۔ اور اس جہاں کو میرے کانٹے سے پاک کر دیجئے۔ (اگر میں قرآن پاک کے بغیر کچھ اور کہہ رہا ہوں)

۲۔ (اگر میں قرآن کے بغیر کچھ اور کہوں) تو مجھے قیامت کے دن رسوا کیجئے اور اپنی پابوسی سے بھی محروم کیجئے۔

اقبال کے نزدیک قرآنِ مجید کتابِ زندگی ہے
اور امت محمدیہ ﷺ کا آئین ہے:

۱۔ تو ہمی دانی کہ آئینِ تو چیست؟
زیرِ گردوں سرِّ تمکینِ تو چیست؟

۲۔ آں کتابِ زندہ قرآنِ حکیم
حکمتِ اولا یزال است و قدیم

۳۔ نسخۂ اسرار تکوینِ حیات
بے ثبات از قوتش گیرد ثبات

۴۔ نوعِ انساں را پیامِ آخریں
حاملِ اور رحمۃٌ للعٰلمین ۱۹

۵۔ گر تو می خواہی مسلماں زیستن
نیست ممکن جز بقرآں زیستن ۲۰

۱۔ کیا تمہیں معلوم ہے کہ تمہارا آئین اور ضابطہ حیات کیا ہے؟
آسماں کے نیچے یعنی زمین پر تیرے تمکّن، اقتدار اور (عظمت و وقار) کی بنیاد کیا ہے؟

۲۔ اس سوال کا جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ تیرا آئین اور ضابطۂ حیات کتابِ زندہ القرآن ہے جو حکمت سے معمور ہے۔ اس کی حکمت ازلی ہے اور قائم و دائم رہنے والی ہے یا لازوال ہے۔

۳۔ یہ انسانی زندگی کی تکوین اور تعمیر کا واحد نسخۂ کیمیا ہے۔ کمزور اور بے بس قومیں اسی نسخۂ کیمیا سے طاقت اور ثبات یا دوام حاصل کرتی ہیں۔

۴۔ یہ کتاب تمام عالمِ انسانیت کے لئے اللہ کی طرف سے آخری پیغامِ ہدایت اور رہنمائی ہے۔
اس کے لانے والے پیغمبر کو اللہ تعالیٰ نے تمام عالمین کے لئے رحمت بنا کر مبعوث فرمایا ہے۔

۵۔ اگر تم مسلمان بن کر جینا چاہتے ہو تو یہ بات قرآن پر عمل کئے بغیر ممکن نہیں ہے۔

حوالہ جات

۱۔احمد شوقی امیر الشعراء،ص ۱۳۔
الدکتور شوقی ضیف ، الأدب العربی المعاصر فی مصر، القاهرة، دارالمعارف، کورنیش النیل ، ۱۹۹۵ءص ۱۱۰۔
۲۔ أحمد شوقی أمیرالشعراء ،ص ۱۵۔
الأزهر و أثره فی النهضة الأدبیة الحدیثة،ص ۵۵۱-۵۵۵۔
۳۔ مصطفیٰ صادق الرافعی، إعجاز القرآن ، بیروت ،دارالکتاب العربی، ۲۰۰۵ء،ص ۱۷-۱۸۔
۴۔احمد شوقی، الشوقیات، الجزء الثالث، مصر، المکتبة التجاریة الکبری ، ۱۹۸۳ء، ص ۴۱۔
۵۔ توفیق الفکیکی، دِفاعٌ عَن شَعَراء، بیروت، دارالکتاب اللبنانی، بلاتاریخ،ص ۶۸
۶۔ دکتورة سعادعبدالوهاب عبدالکریم، إسلامیات أحمد شوقی ، دراسة نقدیة، مصر، مطابع أهرام الجیزة الکبری ،بغیر تاریخ اشاعت،ص ۲۲۷-۳۰۷۔
۷۔الشوقیات، الجزء الأوّل،ص ۳۷
۸۔ایضاً،ص ۱۶۵
۹۔ حسین شوقی ، أبی شوقی، القاهرة،مکتبة النهضة المصریة، ۱۹۴۷ء،ص ۱۶۵
۱۰۔ڈاکٹر جاوید اقبال، زندہ رود، لاہور اقبال اکادمی پاکستان، ۲۰۰۴ء، ص ۴۷۔
۱۱۔ایضاً،ص ۸۴۔
مزید تفصیل کے لئے ایضاً ص ۸۳-۸۵۔
۱۲۔ڈاکٹر غلام مُصطفٰی خان، اقبال اور قرآن، لاہور، ادارہ ثقافت اسلامیہ، ۱۹۷۷ء، ص ۶
۱۳۔ایضاً،ص ۶-۷۔
۱۴۔کلّیات اقبال، (اردو) دہلی، مرکزی مکتبہ اسلامی، ۱۹۹۳ء، ص ۲۳۔
۱۵۔ندوی، عبدالسلام، اقبال کامل، اعظم گڑھ، دارالمصنفین ، ۱۹۴۸ء،ص ۷۶-۷۷۔

۱۶۔ اقبال اور قرآن، ص ۱۴-۱۵۔

۱۷۔ فقیر سیّد وحید الدین، روزگارِ فقیر، نئی دہلی، اسلامک بک فاونڈیشن، ۱۹۹۲ء، ص ۸۰-۸۱۔

۱۸۔ کلیات اقبال (فارسی)، لاہور، عثمان پبلی کیشنز، ۲۰۰۶ء، ص ۴۸۷۔

۱۹۔ ایضاً، ص ۱۹۵

۲۰۔ ایضاً، ص ۱۹۹

☆☆☆☆☆

باب ششم

شوقی اور اقبال کی نعتیہ شاعری

نعتیہ شاعری

نعت کا لفظ اردو ادب میں اس صنفِ سخن کے لئے مخصوص ہے جو نبی کریم ﷺ کی شان میں لکھی جاتی ہے۔ عربی میں اس مقصد کے لئے ''مدح'' کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے جیسے شیخ یوسف بن اسمٰعیل النبهانی کی ترتیب دی ہوئی مشہور کتاب کا نام "المجموعة النّبهانية في المدائح النبويّة" ہے جو چار جلدوں پر مشتمل ہے۔ اسی طرح ڈاکٹر زکی مبارک نے بھی اپنی ایک کتاب کا نام "المدائح النبويّة في الأدب العربي" رکھا ہے۔ [1]
آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سب سے احسن اور اجمل مدح قرآن کریم میں خود اللہ تعالیٰ نے فرمائی ہے۔ ہاں عربی شاعری میں یہ سعادت سب سے پہلے آپ کے عمِ نامدار ابو طالب کو حاصل ہوئی۔ ابن ہشام نے سیرۃ النبی ﷺ میں آپ کے بعض قصائد کے کچھ اشعار نقل کئے ہیں۔ مثلاً آنخضرت ﷺ کی مدح میں کہا ہوا جناب ابو طالب کا یہ شعر جو واقعی صدہا قصائد پر بھاری ہے:

وَ أبيض يُستسقى الغمامُ بِوَجهِهِ
ثِمالُ اليَتَمى عِصمةٌ لِلأرَامِلِ [2]

''وہ روئے زیبا جس کے واسطے سے ابرِ کرم کی دعائیں مانگی جاتی ہیں! وہ یتیموں کا سہارا اور بیواؤں کے سرپرست ہیں''۔
اس کے بعد ترتیب زمانی کے لحاظ سے اُمِ معبد کی وہ مدح بڑی اہمیت کی حامل ہے جس میں قبیلہ خزاعہ کی اس مہمان نواز اور معمر خاتون نے حضور اکرم صلہ اللہ علیہ وسلم کا سراپا اپنے شوہر کے سامنے بیان کیا تھا۔ یہ مدح اگرچہ نثر میں ہے مگر اپنی گوناگوں خوبیوں کے لحاظ سے کسی نظم سے کم نہیں۔ [3]

پھر اعشیٰ کی لغت (مدحیہ قصیدہ) کا ذکر ادب عربی کی تمام جامع کتابوں میں ہے۔ یہ قصیدہ اعشیٰ

کے دیوان میں بھی موجود ہے۔ لیکن سیرت نبوی کی اکثر کتابوں میں اس کا تذکرہ نہیں ہے۔
غالباً اصحاب سیَر نے اس کو قصداً نظر انداز کر دیا ہے، کیونکہ وہ ایمان نہیں لایا تھا۔ ۴
اس قصیدہ میں تشبیب کے بعد اپنی اونٹنی کے بارے میں کہتا ہے:

۱۔ فآليت لا أرثي لها من كلالة
ولا من وحى حتى تزور محمدا

۲۔ متى ما تناخي عند باب ابن هاشم
تراحي و تلقي من فواضله ندى ۵

۱۔ ''میں نے قسم کھائی ہے کہ اپنی اونٹنی کی کمزوری اور برہنہ پائی پر اس وقت تک ترس نہیں کھاؤں گا جب تک نہ وہ مجھے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچا دے گی۔
۲۔ جب تم اونٹنی کو ابن ہاشم صلی اللہ علیہ وسلم کے در پر بٹھاؤ گے تو وہ راحت پائے گی اور آپ ان کی (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) بخششوں سے فیضیاب ہو جائیں گے''۔

مُخضرَم شعراء (جاہلیت اور اسلام دونوں زمانوں میں عمدہ شاعری کرنے والے شعراء) میں حضرت کعبؓ بن زُہَیر بن ابی سلمیٰ کا قصیدہ ''بَانَتْ سُعَادُ'' بہت ہی مشہور و مقبول ہے۔ فتح مکہ کے بعد جب کعب بن زُہَیر تائب ہو کر حضورؐ کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئے، حضورؐ کے مبارک ہاتھوں میں اپنا ہاتھ رکھا اور مشرّف بہ اسلام ہوئے۔ حضورِ پرنورؐ نے آپؓ کو امان دی۔ اس موقع پر حضرت کعبؓ نے اپنا قصیدہ ''بَانَتْ سُعاد'' سنانے کی خواستگاری کی تو حضور ﷺ نے اجازت مرحمت فرمائی۔

۱۵۸ اشعار پر مشتمل یہ قصیدہ ادبی نقطۂ نظر سے جاہلی ادب کی مکمل نمائندگی کرتا ہے۔ پہلے تشبیب میں ایک فرضی محبوبہ ''سُعَادُ'' کا ذکر کیا ہے اور ابتدائی تیرہ اشعار میں اسی کا سراپا نظر آتا ہے۔

بَانَتْ سُعَادُ فَقَلْبِي الْيَوْمَ مَتْبُولُ
مُتَيَّمٌ إِثْرَهَا لَمْ يُفْدَ مَكْبُولُ

''سُعاد مجھے چھوڑ کر چلی گئی تو آج میرا دل صد پارہ ہو گیا ور دیوانہ وار اس کے پیچھے اس قیدی کی طرح بھاگا جا رہا ہے جس کو فدیہ دے کر چھڑایا نہیں گیا''۔

پھر چودھویں شعر سے چونتیسویں شعر تک اس اونٹنی کے اوصاف بیان کئے گئے ہیں جو شاعر کو اپنی فرضی محبوبہ کے پاس لے جاسکے کیونکہ وہ (سُعاد) اس سے بہت دور چلی گئی ہے۔

۳۵ ویں شعر سے ۳۸ ویں شعر تک اونٹی، چغل خور اور شاعر کے اپنے اضطراب کا مضمون ہے۔

اس کے بعد حسنِ گریز میں ۲۹ ویں شعر سے ۵۰ ویں شعر تک نبی اکرم ﷺ سے معذرت خواہی اور عفو و درگزر کی التجا ہے پھر ۵۱ واں شعر نبی اکرم ﷺ کی مدح کا ہے:

اِنَّ الرَّسُولَ لَنُورٌ یُستَصنَاءُ بِہِ

وَصَارِمٌ مِن سُیُوفِ اللّٰہِ مَسلُولُ

''بیشک رسول اللہ ﷺ ایک نورِ الٰہی ہیں جن سے ہدایت کی روشنی حاصل کی جاتی ہے اور اللہ کی ایک ایسی ضوفشاں تلوار ہیں جو نیام سے باہر کھینچی ہوئی ہے''۔

اس شعر کو شاہِ بیت کہیں یا حاصلِ قصیدہ تو بے جا نہ ہوگا کیونکہ اسے اللہ کے رسول ﷺ نے پسند فرمایا، اس کی اصلاح بھی فرمائی اور فرطِ انبساط میں شاعر کو اپنی چادرِ مبارک اڑھا دی۔ ایسے شعر پر ہزاروں قصائد قربان اور صدہا دواوین نثار۔ ۶

ابوبکر الانباری روایت کرتے ہیں کہ جب شاعر نے مذکورہ بالا شعر سنایا تو'' رمی الیہ رسول اللہ ﷺ بردۃ التی کانت علیہ '' تو رسول اللہ ﷺ نے اپنی چادر مبارک شاعر کو عنایت فرمائی۔ ۷

الدکتور زکی المحاسنی لکھتے ہیں کہ جب شاعر اپنا یہ شعر

اِنَّ الرَّسُولَ لَنُورٌ یُستَضَاءُ بِہ

وَ صَارِمٌ مِن سیوف الھِندِ مسلول

سنا چکے تو اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا کہ

''وَصَارِمٌ'' من سیوف اللہ مسلول'' کہو یعنی ''من سیوف الھند'' ''ہندی تلوار) کے بجائے'' من سیوف اللہ'' (اللہ کی تلوار) فرما کر شعر کی اصلاح فرمائی۔ ۸

قصیدہ کے باقی سات اشعار میں صحابہ کرام رضوان اللہ تعالٰی علیھم اجمعین کے

اوصاف حمیدہ کو بیان کیا گیا ہے۔

طبقہ مُخضرَ مین میں جن شعراء نے آنخضرت ﷺ کی طرف سے مدافعت کا کام کیا اور معاندین و مخالفین اسلام کا منہ توڑ جواب دیا ان میں لبید بن ربیعہ، حسان بن ثابت انصاری، کعب بن مالک اور عبداللہ بن رواحہ رضوان اللہ تعالیٰ علیھم اجمعین سرفہرست ہیں۔ لیکن ان میں بھی حضرت حسانؓ کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ خود رسول رحمت ﷺ نے ان کے لئے مسجد نبوی میں ایک منبر رکھوایا جس پر بیٹھ کر وہ شعر سناتے تھے۔ ۹ آنخضرت ﷺ نے ان سے یہ بھی کہا تھا کہ ''اَجبْ عنی، اللھم اَیِّدہ بروحِ القدس '' (یعنی اے حسان، میری طرف سے ان قریشی شاعروں کا جواب دو، اے اللہ اس کی یعنی ''حسان کی'' روح القدس کے ذریعہ تائید کر) ۱۰

اس حکم کی تعمیل کرتے ہوئے حضرت حسان، ابوسفیان کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

۱۔ هَجَوتَ محمّداً فَاَجبتُ عَنهُ
وعِندَ اللّٰهِ فی ذاكَ الجزاء

۲۔ هَجَوتَ مُبارَكاً بَرّاً حَنیفاً
اَمینَ اللّٰهِ، شِیمَتُهُ الوَفاءُ

۳۔ فَاِنَّ اَبی وَ والِدَهُ وَعِرضِی
لِعِرضِ مُحمّدٍ مِنكُم وَقاءُ ۱۱

۱۔ تم نے محمد کی برائی کی، میں نے ان کی طرف سے جواب دیا اور عنداللہ میرے اس کام کا صلہ ہے۔

۲۔ تو نے ایسے شخص کی برائی کی ہے جو بابرکت ہے، نیک ہے، اللہ والا ہے، خدا کے یہاں معتبر ہے، جس کی خصلت میں وفاشعاری ہے۔

۳۔ میرا باپ اور میرے باپ کا باپ اور میری عزت محمد ﷺ کی عزت کے لئے تمہارے مقابلہ میں ڈھال ہے۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ عربی زبان میں حضرت کعب بن زُھیرؓ نے آنخضرتؐ کی شان میں قصیدۃ ''بَانَت سُعادُ'' لکھ کر جو مقبولیت حاصل کی وہ اپنی مثال آپ ہے۔ اس کی عربی و غیر

عربی زبانوں میں کثیر شرحیں لکھی گئیں اور بہت سے عربی شعراء نے اس قصیدہ پر تخمیس، مسدّس اور مسبّع کی صورت میں طبع آزمائی کی۔ ۱۲ رفتہ رفتہ آنحضرت ﷺ کی شان میں اس قسم کے مدحیہ اور وصفیہ قصائد کا رواج عام ہو گیا اور اس طرح ایک مخصوص طرح کا صنفِ سخن وجود میں آیا جیسے امام بوصیریؒ کا "قصیدۂ بردہ"۔

روایت ہے کہ امام بوصیریؒ (ابو عبداللہ محمد بن سعید بن حماد۔ ۶۰۸ھ - ۶۹۷ھ) کے جسم کے نصف حصّہ پر فالج گر گیا تھا۔ بہت علاج و معالجہ کے بعد جب ٹھیک نہ ہوئے تو اس حال میں انہوں نے یہ قصیدہ لکھا۔ رب جلیل کی بارگاہ میں اسے شرفِ قبولیت حاصل ہوئی۔ چنانچہ بوصیری کو خواب میں رسول اللہ ﷺ کی زیارت نصیب ہوئی۔ آپ ﷺ نے ان پر اپنی چادر مبارک (بردہ) ڈال دی اور دستِ مبارک ان کے رخسار پر پھیرا۔ آنکھ کھولی تو شفایاب ہو چکے تھے۔ ۱۳

ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی لکھتے ہیں کہ "یہ قصیدہ جس درجہ مقبول ہوا، اس درجہ قصیدہ "بانت سعاد" کو بھی مقبولیت حاصل نہیں ہوئی، لاکھوں کی تعداد میں شائع ہو چکا ہے اور ہمیشہ کوئی نہ کوئی نئی شرح لکھتا رہتا ہے، سینکڑوں (بلا مبالغہ) قصیدے اس زمین پر کہے جا چکے، پچاسوں تضمینیں اور مشطّر، مخمّس، مسدّس، مسبّع اور معشّر کہے گئے"۔ ۱۴

ہمارے زیرِ بحث دونوں شاعر (شوقی اور اقبال) امام بوصیریؒ سے بے حد متاثر ہیں۔ شوقی اگرچہ المتنبی کے بعد عربی زبان کے سب سے بڑے شاعر مانے جاتے ہیں، أمیر الشعراء اور شاعر الاسلام کے لقب سے یاد کیے جاتے ہیں لیکن اس نے اپنے مشہور و معروف نعتیہ قصیدہ کو "قصیدہ بُردہ" کی تضمین کہا نہ تقریض بلکہ اس کا عنوان "نهج البردة" رکھا یعنی یہ قصیدہ، "قصیدۂ بردہ" کے طرز یا اس کی تقلید میں لکھا گیا ہے۔ پھر "نهج البردة" کے شعر نمبر ایک سو ایک (۱۰۱) سے ایک سو چار (۱۰۴) تک امام بوصیریؒ کی برتری اور اپنی فروتنی کا اظہار بھی کیا ہے:

۱- المـادِحُون و أربـابُ الهَـوَى تبَع   لـصاحِـبِ البُـردةِ الفيحاَءِ ذي القَدَمِ

۲- مديُحه، فيكَ حُبّ خَالِص و هَوى   وصادِقُ الحـبّ يُملي صادقَ الكلمِ

۳- اَللّٰـــهُ يَشْهَــدُ اَنّــى لَا اُعَـارِضُــهُ   مَنْ ذَا يُعَارِضُ صَوْبَ الْعَارِضِ الْعَرِمِ؟

۴- وَاِنَّمَا اَنَا بَعْضُ الْغَابِطِيْنَ، وَ مَنْ   يَغْبِطْ وَلِيَّكَ لَا يُذْمَمْ وَ لَا يُلَمْ ۱۵؎

۱۔ نبی اکرم ﷺ کی نعت لکھنے والے اور آپ ﷺ سے وارفتگی رکھنے والے صاحب بردہ (امام بوصیریؒ) کے نقشِ قدم پر چلتے ہیں جو بحرِ ناپیدا کنار اور سبقت رکھنے والے ہیں۔

۲۔ آپ ﷺ کے بارے میں ان (بوصیری) کی نعت، حبّ خالص اور سچی وارفتگی ہے۔ اور سچی وارفتگی رکھنے والا اپنے دل کی بات ہی کہتا ہے۔

۳۔ خُدا گواہ ہے کہ میں نے ان کے قصیدہ (بردہ) کا معارضہ نہیں لکھا ہے۔

بھلا موسلا دار بارش برسانے والے بادلوں کا کون مقابلہ کر سکتا ہے۔

۴۔ میں نے تو ان کے ساتھ رشک کیا ہے اور جو آپؐ کے ولی کے ساتھ رشک کرتا ہے اس کی نہ تو مذمت کی جاتی ہے اور نہ ملامت۔

علامہ محمد اقبال نے اپنی ایک معروف نعت میں امام بوصیریؒ کا ذکر اپنے مخصوص انداز میں کیا ہے۔ اس نعت کا عنوان ہے ''عرض مصنف در حضورِ رسالت مآب ﷺ'' اقبال ان دنوں علیل تھے اور بغرض علاج بھوپال تشریف لے گئے تھے۔

ڈاکٹر جاوید اقبال اس سلسلے میں رقمطراز ہیں:

''۳ راپریل ۱۹۳۶ءکی رات کو شیش محل میں سو رہے تھے کہ سر سیّد احمد خان کو خواب میں دیکھا۔ وہ پوچھتے ہیں: تم کب سے بیمار ہو! جواب دیا: دو سال سے اوپر مدت گزر گئی۔ فرمایا، حضور رسالت مآب ﷺ کی خدمت میں عرض کرو۔ اسی وقت ان کی آنکھ کھل گئی اور حضور رسالت مآب ﷺ کی خدمت میں نذرانۂ عقیدت پیش کرنے کی خاطر اشعار ان کی زبان پر جاری ہو گئے۔ ۱۶؎

۶۲ راشعار پر مشتمل یہ نعت ایک غمزدہ دل کی فریاد ہے۔ اس میں علامہ مرحوم نے اپنے درد کا کم اور امتِ مسلمہ کی ان بیماریوں کا زیادہ ذکر کیا ہے جن کی وجہ سے وہ برلبِ گور ہے۔ یہاں ہم چندان ہی اشعار کو پیش کرتے ہیں جن میں انہوں نے اپنے درد کی دوا کے لئے خواستگاری کی ہے اور ساتھ ہی امام بوصیری کا ذکر بھی کیا ہے:

۱۔ آہ زاں دردے کہ درجان وتن است گوشۂ چشمِ تو داروئے من است

۲۔ ورنہ سازد بادواہا جانِ زار تلخ و بویش برمشامم ناگوار

۳۔ چوں بُصیری از تو مے خواہم کشود تابمن آید آں روزے کہ بود

۴۔ مہرِ تو بر عاصیاں افزوں تراست درخطا بخشی چو مہرِ مادر است ؎۱

۱۔ آہ اس درد پر جو میرے جان وتن میں ہے آپ ﷺ کی اک نگہ التفات اس درد کی دوا ہے۔

۲۔ میری جانِ ناتواں اب ان دواؤں کی متحمل نہیں ہے۔ ان دواؤں کی کڑواہٹ اور بو میری سونگھنے کی قوت پر گراں گزرتی ہے۔

۳۔ میں (امام بوصیریؒ کی طرح آپ ﷺ کی ذاتِ والا صفات سے اپنی بیماریوں کا شفا بخش علاج چاہتا ہوں تاکہ مجھے دوبارہ اپنا ماضی حاصل ہو جائے۔

۴۔ آپؐ کے عفو و درگزر کی مثال اس ماں کی سی ہے جو اپنے بچے کی شرارتیں اور تلخیاں نظر انداز کر کے اسے اپنے گلے سے لگاتی ہے۔

چونکہ احمد شوقی نے اپنی شاعری صرف عربی زبان میں کی ہے جبکہ اقبال نے فارسی اور اردو میں۔ اس سلسلے میں ہم چند اہم نکات کو سامنے رکھے بغیر اپنے موضوع کے ساتھ انصاف نہیں کر سکتے ہیں۔ جناب ابوالحسن علی ندویؒ اس کے لئے بہترین رہنمائی فراہم کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

''دنیا کا کوئی ملک جو اسلام کی دولت سے مشرف ہوا، کسی دور میں بھی ایسے شعراء سے خالی نہیں رہا۔ جنہوں نے اپنی بہترین شاعرانہ صلاحیتیں اس بہترین موضوع پر اور محمود و ممدوح ذات کی مدح و توصیف میں صرف نہ کی ہوں۔

مختلف اسباب کی بنا پر جن کا تعلق فطری اور قومی خصوصیات، خمیر و مزاج اور بعض تاریخی اسباب سے ہے اور جن کا مختصر تذکرہ ہم نے اپنی کتاب ''کاروانِ مدینہ'' کے مضمون ''سیّد العرب والعجم کے حضور میں شعرائے عجم کا خراجِ عقیدت'' میں کیا ہے، فارسی زبان کا قدم اس وادی ایمن کی رہ نوردی میں سب سے آگے رہا ہے، اردو چونکہ اس کی ساختہ پرداختہ ہے، اس لئے اس کے بعد اسی کا درجہ ہے''۔

پھر آگے مزید لکھتے ہیں:

''اس میں کوئی شبہ نہیں کہ زبانوں اور ملکوں کا مزاج مختلف ہوتا ہے، ان کے اظہارِ جذبات کے طریقے، مضامین کی ترتیب، غزل و تشبیب کے اسالیب، استعارات و تشبیہات، سب ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔ اور یہ اختلاف نتیجہ ہوتا ہے، جغرافیائی، طبعی حالات، تاریخی عوامل و مؤثرات اور ذاتی تجربات کے اختلاف کا۔

اسلئے ہر زبان کی شاعری کا پیمانہ بھی ایک نہیں ہو سکتا اور ہر زبان کی نعت میں ایک ہی طرح کے مضامین تلاش نہیں کیے جا سکتے، اور نہ درد و سوز، لطافت و نزاکت، ہجر و جدائی کی کسک اور خلش کو ہر جگہ ڈھونڈنا صحیح ہوگا۔ اگر اس حقیقت کو مان لیا جائے تو عربی شاعری نعت کے ذخیرے سے مالا مال ہے اور بہت سی ایسی خصوصیات رکھتی ہے، جن میں وہ منفرد کہی جا سکتی ہے۔''[۱۸]

ہر صاحب نظر شوقی اور اقبال کی شاعری میں مذکورہ بالا حقائق کا ادراک کر سکتا ہے لیکن اس کے باوجود دونوں کی نعتیہ شاعری میں بہت سی باتیں قدرِ مشترک کی حیثیت رکھتی ہیں اسلئے کہ دونوں کے دل حب رسول سے سرشار تھے اور زندگی کے آخری ایام میں یہ عشق و محبت کا پیمانہ کچھ زیادہ ہی لبریز ہوا تھا۔

شوقی کی نعتیہ شاعری

اُمیر الشعراء اُحمد شوقی نے نبی اکرم ﷺ کی مدح میں پانچ مشہور قصائد لکھے ہیں۔ ان میں ''نھج البردۃ'' کو غیر معمولی شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی۔ اسے شوقی نے ۱۹۱۰ء میں لکھا اور یہ نعتیہ قصیدہ بعض نسخوں میں دو سو پانچ اشعار پر مشتمل ہے [۱۸] جبکہ بعض باحثین نے صرف ایک سو نوے اشعار نقل کئے ہیں۔ [۲۰] اس میں شاعر نے امام بوصیریؒ کے ''قصیدہ بردہ'' کے بحر و قافیہ کی پیروی کی ہے اور امام بوصیریؒ نے اپنے قصیدہ کے لئے مشہور بزرگ شاعر ابن الفارضؒ کی زمین پسند فرمائی ہے۔

ابن الفارض کے قصیدہ کا مطلع ہے:

هَلْ نارُ لَيلى بَدَتْ لَيلاً بِذِى سلَمِ

أم بارِقٌ لاَحَ فِي الزَّوراءِ وَ الْعَلَمِ [۲۱]

(کیا لیلیٰ کے گھر جلائی جانے والی آگ رات کو ذو سلم میں ظاہر ہوئی یا کوئی بجلی ہے، جو زوراء اور علم میں چمکی۔) حضرت بوصیریؒ کی نعت کا مطلع ہے:

أمِنْ تَذَكُّرِ جِيرَانٍ بِذِى سَلَمِ

مَزَجْتَ دَمْعاً جرَى مِنْ مُقْلَةٍ بِدَمِ [۲۲]

(کیا تمہیں ذو سلم کے ہمسائے یاد آ رہے ہیں جو تیری آنکھوں سے خون آلودہ آنسو رواں ہیں۔) اور شوقی کی نعت کا مطلع ہے:

رِيمٌ عَلى القاعِ بينَ البانِ و العَلَمِ

أحلَّ سَفْكَ دَمِي فى الأشهُرِ الحرمِ [۲۳]

(ایک ہرنی جو 'بان'' کے درختوں اور ٹیلوں کے درمیان ایک وادی میں ہے، اس نے حرمت کے مہینوں میں میرے خون کے بہائے جانے کو حلال کر دیا۔)

امام بوصیریؒ کے ''قصیدہ بردہ'' کی تقلید میں اسی بحر و ردیف اور قافیہ میں سینکڑوں قصائد لکھے گئے لیکن جو شرف شوقی کے قصیدہ کو حاصل ہوا اس کی اب تک کوئی نظیر نہیں ملتی ہے۔ وہ اس طرح کہ الأستاذ الأکبر۔ الشیخ سلیم البشری۔ جیسے نابغۂ عصر نے اس قصیدہ کی شرح لکھ دی۔ اُن کے بعد تو وافر مقدار میں اس کی شرحیں لکھی گئیں۔ ۲۴

ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی لکھتے ہیں:

''شوقی کا قصیدہ (نہج البردۃ) الفاظ و ترکیب اور شعری محاسن کے لحاظ سے واقعی عربی زبان کے لئے حجّت ہے''۔ ۲۵

یہ قصیدہ روایتی تشبیب سے شروع ہوتا ہے۔ پھر ولادت نبوی سے قبل دنیا کی حالت، خاص طور پر عربوں کی دینی اور معاشرتی زندگی کی طرف بلیغ اشارے، آپ کی ولادتِ باسعادت، رفاقتِ خدیجہؓ، غارحرا میں تبتّل، نزولِ وحی، ورقہ بن نوفل کی پیشین گوئی، ہجرت اور اس دوران غارثور میں مشرکین مکہ سے چھپکر قیام، آپؐ کے معجزات خاص طور پر قرآن کریم، اُن معاندین کا رَد اور منہ توڑ جواب جو یہ کہتے ہیں کہ اسلام تلوار سے پھیلا ہے، آپؐ کے اخلاقِ فاضلہ کا ذکر، آپؐ کی دعوت کا اثر پھر اس پر عمل پیرا ہونے سے مسلمانوں کا عروج وغیرہ۔ اس طرح شوقی حسنِ ترتیب کے ساتھ اپنے ذوق و شوق کو سامنے لائے ہیں اور یہی اس قصیدہ کے بے قیمت گہرہائے آبدار ہیں۔ آخر میں پورا قصیدہ بتدریج آل و اصحب رسولؐ پر دُعا و سلام کے ساتھ اپنی ارتقاء کو پہنچتا ہے۔ اس میں سے چند اشعار ''مشتے نمونہ از خروارے'' کے طور پر پیش کیے جاتے ہیں:

۱۔ إنْ جَلَّ ذَنْبِيُ عن الغُفرانِ لي أملٌ
في اللّهِ يجعلني في خيرِ مُعتصِمِ

۲۔ وإنْ تقدَّم ذو تقوى بصالحةٍ
قدمتُ بين يديه عَبْرَةَ النَدمِ

۳۔ علقتُ من مدحهِ حبلاً أعزّبه
في يومِ لاعزَّ بالأنسابِ واللُّحَمِ ۲۶

۴۔ محمدٌ صفوتُ الباري، ورحمتُهُ
وبغيةُ اللّٰهِ من خلقٍ ومن نسمِ ۲۷

۵۔ البدرُ دونكَ في حسنٍ وفي شرفٍ
والبحرُ دونكَ في خيرٍ وفي كرمِ ۲۸

ا۔اگرچہ میرے گناہ ناقابل بخشش ہیں،لیکن مجھے اللہ کی ذات سے امید ہے کہ وہ مجھے اپنی پناہ میں لے لے گا۔
۲۔جب پرہیزگار لوگ اپنے اعمالِ صالحہ پیش کریں گے تو میں اس کے حضور اشکِ ندامت پیش کروں گا۔
۳۔میں نے ان کی (نبی اکرم ﷺ) مدح کر کے ایک رسی پکڑ لی ہے،جو میرے لئے اس دن باعث فخر ہوگی جس دن رشتوں اور حسب ونسب پر فخر نہیں کیا جائے گا۔
۴۔محمد ﷺ اللہ تعالیٰ کی منتخب ترین خلقت اور اس کی رحمت کا مظہر ہیں اور ساری انسانیت اور مخلوقات میں اس کے مطلوب ومرغوب ہیں۔
۵۔چاند حسن وشرف میں آپ ﷺ سے کمتر ہے اور سمندر خیر وکرم میں آپ ﷺ سے پیچھے ہے۔
شوقی کے باقی ماندہ نعتیہ قصائد درج ذیل ہیں
''۲۔ذکری المولد (اوّل):اسے ۱۹۱۱ء میں لکھا اور یہ ننانوے (۹۹) اشعار پر مشتمل ہے۔
۳۔ذکری المولد (دوم):اسے ۱۹۱۴ء میں لکھا اور یہ اکہتر (۷۱) اشعار پر مشتمل ہے۔
۴۔الهمزية النبوية:اسے ۱۹۱۷ء میں لکھا اور یہ ایک سو اکتیس (۱۳۱) اشعار پر مشتمل ہے۔
۵۔ایک طویل ارجوزۃ جس کا عنوان ہے''دول العرب و عظماء الاسلام''۔یہ ایک ہزار سات سو چھبیس (۱۷۲۶) اشعار پر مشتمل ہے۔اسے شوقی نے اندلس (Spain) میں اپنی جلاوطنی کے دوران لکھا ہے۔اگرچہ یہ ارجوزۃ اسلامی تاریخ سے متعلق ہے لیکن اس میں نبی اکرم ﷺ کی سیرت طیبہ کے لئے ایک سو ترپن (۱۵۳) اشعار مختص کئے گئے ہیں۔

اس کے علاوہ ان کے کئی اور مشہور قصائد میں نعتیہ اشعار کثرت سے ملتے ہیں جیسے (۱) کبار الحوادث فی وادی النیل (۲) مرحبا بالھلال (۳) وداع الدکتور محبوب ثابت وغیرہ۔۲۹

شوقی کا نعتیہ کلام کلاسیکی عربی ادب کی تمام خوبیوں اور شعری محاسن کو اپنے اندر سمیٹے

ہوئے ہے۔ ترکیبیں آسان، الفاظ شگفتہ، زبان و بیان پر بے پناہ قدرت ہر نعت کی نمایاں خصوصیت ہے۔ نبی اکرم ﷺ کی ذاتِ اقدس سے بے پناہ محبت وعقیدت اور اخلاص ووفا کے علاوہ ملّتِ اسلامیہ کے دین کے ساتھ تغافل وتجاہل کا شکوہ بھی ان کی امتیازی شان ہے"۔ ۳۰

"ذکری المولد" شوقی کا دوسرا مشہور قصیدہ ہے۔ اس میں تشبیب کے بعد نبی اکرم ﷺ کی ولادتِ باسعادت کا ذکر کیا گیا ہے۔ چند شعر درج ذیل ہیں:

۱۔ وأسدَتْ لِلبريةِ بِنتُ وهبٍ
يداً بيضاءَ، طوقتِ الرقابا

۲۔ لقد وضعَتْهُ وَهّاجاً، منيراً
كَما تَلِدُ السماواتُ الشهابا

۳۔ وضاعت يثربُ الفيحاءُ مِسكاً
وفاحَ القاعُ أرجاءً وطابا

۴۔ أبا الزهراء قد جاوزتُ قدري
بِمَدْحِكَ، بَيْدَ أن لِيَ انتسابا ۳۰

۱۔ بنت وہب (نبی اکرم ﷺ کی والدہ ماجدہ) نے سارے عالم پر احسان کیا، اور اس عظیم احسان کا قلادہ ہر ایک کی گردن میں ڈال دیا۔

۲۔ انہوں نے حضور ﷺ کو ایک آفتابِ عالم تاب کی صورت میں جنم دیا، جس طرح آسمانوں سے روشن ستارے پیدا ہوتے ہیں۔

۳۔ معطر یثرب مشک سے مہک اٹھا اور وادیوں کے گوشے گوشے عطر بیز ہو گئے اور ان کی رعنائی بڑھ گئی۔

۴۔ پدر زہراء میں نے آپ ﷺ کی مدح کر کے اپنی حیثیت سے تجاوز کیا، ہاں مجھے ایک امتی کی نسبت ضرور حاصل ہے۔

"الھمزیۃ النبویۃ" ایک غیر معمولی قصیدہ ہے۔ اسے بھی شوقی نے امام بوصیریؒ کے ہمزیہ کے تتبع میں لکھا ہے مگر اس کی آہنگ اور اس کا انداز علامہ محمد اقبال کی نعتیہ شاعری سے زیادہ قریب ہے۔ چند اشعار درج ذیل ہیں:

١۔ أنت الذی نظمَ البریَّةَ دینُهُ
مـاذا یقول و ینظم الشعراءُ
٢۔ المُصلِحون أصابع جُمِعت یَداً
هي أنت، بَلْ أنت الیدُ البیضاءُ
٣۔ ماجئتُ بابكَ مادِحاً، بَل دَاعِیاً
و مِنَ المَدِیحِ المدی تضرّعٌ و دُعاءُ
٤۔ أدعُوكَ عن قومي الضّعافِ لازمة
في مثلها یُلقَی علیك رجاءُ
٥۔ أدری رسولُ اللّهِ أنَّ نفوسَهم
رَکِبَتْ هَواهَا، والقلوب هَواءُ
٦۔ مُتفَکِّکُون، فماتَضمُّ نفوسَهُم
ثِقَةٌ، ولا جمع القلوب صفاءُ ۳۱ؔ

١۔ آپ ہی وہ ذات اقدس ہیں کہ جس کے دین نے تمام مخلوق کوایک لڑی میں پرودیا۔ یہ شاعر لوگ کیا کہتے اور کیا نظم کرتے!

٢۔ تمام مصلحین انگلیاں ہیں جوایک ہاتھ کی وجہ سے اکٹھی ہوگئیں اور وہ مبارک ہاتھ آپؐ ہیں بلکہ آپ ﷺ تو یدِ بیضا ہیں۔

٣۔ میں آپ ﷺ کے دروازہ پر نعت کہنے کے لئے حاضر نہیں ہوا بلکہ خواستگاری کرنے آیا ہوں اور بعض اوقات مدح ہی اظہار عاجزی اور دعا کا قائم مقام ہوجاتی ہے۔

٤۔ میں اپنی کمزور قوم کی طرف سے آپؐ سے ایسی مصیبت میں التجا کرتا ہوں کہ اس جیسی مصیبت میں آپؐ سے ہی امید کی جاسکتی ہے۔

٥۔ کیا اللہ کے رسول ﷺ کو معلوم ہے کہ ان کے (امت مسلمہ کے) نفوس خواہشات پر سوار ہیں اور ان کے دل کمزور ہیں۔

٦۔ وہ الگ الگ ہیں (بکھرے ہوئے ہیں) اور ان کے نفوس کو اعتماد متحد و متفق نہیں کرتا اور نہ خلوص دلوں کی تالیف کرتا ہے۔

شوقی امت مسلمہ کی دین سے غفلت شعاری کی آئینہ داری کرتے ہوئے فریاد کرتے ہیں:

۱۔ رَقَدُوا و غَرّهُمُ نعیمٌ باطلٌ
و نعیمُ القومِ فی القیودِ بَلاءُ

۲۔ ظَلَمُوا شریعتکَ التی نِلنا بِہا
مالَمُ ینلُ فی رومۃَ الفُقَہاءُ

۳۔ مشتِ الحضارۃُ فی سَناھا، واھتدی
فی الدّینِ والدُّنیا بِہا السُّعداءُ ۳۲

۱۔ وہ خواب غفلت میں پڑے سوئے ہیں اور جھوٹی آسودہ حالی ان کو دھوکا دئے ہوئے ہے اور کسی قوم کی وہ نعمتیں جو اُسے قید و بند میں نصیب ہوں، بذاتِ خود مصیبت اور بلا ہوتی ہیں۔

۲۔ ان لوگوں نے آپ کی شریعت پر ظلم کیا۔ یہ وہی شریعت ہے جس کی بدولت ہم نے وہ کچھ پایا جو روم کے داناؤں کو بھی نہیں ملا تھا۔

۳۔ تہذیب و تمدن نے آپ کی شریعت کی روشنی میں نشو و نماء پائی اور اس کے ذریعے دین و دنیا میں خوش نصیب لوگوں نے ہدایت پائی۔

ان عاطفہ سے بھرپور نعتیہ قصائد کے مطالعہ سے یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ امیر الشعراء احمد شوقی ایک راسخ العقیدہ مسلمان ہونے کے ساتھ ساتھ آنحضرت ﷺ کی ذاتِ اقدس کے ساتھ وارفتگی، والہانہ عقیدت اور بے پناہ محبت رکھتے تھے۔ امتِ مسلمہ کی زبوں حالی نے ان کے قلب و ذہن پر جو اثرات مرتب کئے تھے، شوقی نے ان کا بھی بھرپور اظہار کیا ہے، رویا بھی ہے اور فریاد بھی کی ہے۔ فضائل اسلام اور اس کے آفاقی اقدار کی بڑی جرأت کے ساتھ وکالت کی ہے۔ نبی اکرم ﷺ کے مخالفین کا مُسکت جواب بھی دیا ہے۔ اسلئے عبدالعزیز الاِسلامبولی جو ایک ناقد اور مشہور شوقی شناس ہیں۔ لکھتے ہیں:

''یہ بے بہا قصائد جو شوقی نے نبی اکرم ﷺ کی مدح میں پروئے ہیں، کیا شعراء اسلام میں سے کوئی ایک شاعر ان سے بہتر کاوش پیش کر سکا ہے.......... بالکل نہیں''۔ ۳۳

اقبال کی نعتیہ شاعری

علامہ محمد اقبال کو آنحضرت ﷺ کی ذاتِ اقدس سے کس قدر وارفتگی اور والہانہ عقیدت تھی اس کا اظہار ان کے کلام میں جا بجا ملتا ہے۔ وفورِ شوق میں جب وہ اپنے وارداتِ قلب کو شاعری کا جامہ پہناتے ہیں تو اپنا جگر چیر کے رکھ دیتے ہیں۔ اس لحاظ سے ان کی نعتیہ شاعری منفرد، یکتا اور بے مثال ہے۔

مولانا عبدالسلام ندویؒ لکھتے ہیں کہ "ڈاکٹر صاحب (اقبال) کو رسول اللہ ﷺ کی نبوّت پر اعتقاد ہی نہ تھا بلکہ آپ ﷺ کے ساتھ انتہا درجہ کا عشق تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب حضور ﷺ کا نامِ مبارک یا ذکرِ مبارک کسی کی زبان پر آجاتا تو ان کی آنکھیں بے اختیار اشک آلود ہو جاتیں۔ ان کی زندگی کے آخری ایام کا ذکر ہے کہ "یوم اقبال" کے موقع پر مولانا اسلم صاحب جیراجپوری نیاز حاصل کرنے کے لئے گئے اور دیر تک سلسلۂ گفتگو جاری رہا۔ اس سال وہ حج کا ارادہ رکھتے تھے لیکن بیماری اور کمزوری کی حالت یہ تھی کہ کوٹھے سے باہر نکلنا بھی مشکل تھا۔ کہتے تھے کہ میں دو سال سے ارادۂ سفرِ حج میں ہوں۔ بلکہ وہ اشعار بھی لکھ لئے ہیں جو سفر سے متعلق ہیں۔ ان میں سے کہیں کہیں سے کچھ سنایا بھی۔ مکہ سے مدینہ کی طرف روانگی کے وقت ایک رُباعی لکھی ہے، جس میں اللہ کو مخاطب کر کے کہتے ہیں:۔

تو باش اینجا و با خاصاں بیامیز — کہ من دارم ہوائے منزلِ دوست

(تو مکہ میں اپنے خاص بندوں کے ساتھ مل جل کر رہ کیونکہ میں تو محبوب کی منزل نبی کریم ﷺ کے شہر مدینہ پہنچنے کی آرزو رکھتا ہوں۔)

یہ شعر سناتے ہی گریہ ایسا گلو گیر ہو گیا کہ آواز بند ہو گئی اور آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے۔" [۳۴]

سید مودودیؒ نے رسول رحمت ﷺ کی ذاتِ مبارک کے ساتھ اقبال کی قلبی اور ذہنی وابستگی کو نہایت موثر طریقے سے لکھا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ''رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ مبارک کے ساتھ ان کی والہانہ عقیدت کا حال اکثر لوگوں کو معلوم ہے مگر یہ شاید کسی کو نہیں معلوم کہ انہوں نے اپنے سارے تفلسف اور اپنی تمام عقلیت کو رسول عربیؐ کے قدموں میں ایک متاعِ حقیر کی طرح نذر کر کے رکھ دیا تھا۔ حدیث کی جن باتوں پر نئے تعلیم یافتہ نہیں، پرانے مولوی تک کان کھڑے کرتے ہیں پہلو بدل بدل کرتاویلیں کرنے لگتے ہیں۔ یہ ڈاکٹر آف فلاسفی ان کے ٹھیٹھ لفظی مفہوم پر ایمان رکھتا تھا اور ایسی کوئی حدیث سن کر ایک لمحہ کے لئے بھی اس کے دل میں شک کا گزر نہ ہوتا تھا۔ ایک مرتبہ ایک صاحب نے ان کے سامنے بڑے اچنبھے کے انداز میں اس حدیث کا ذکر کیا جس میں بیان ہوا ہے کہ رسول اللہ ﷺ اصحاب ثلاثہ کے ساتھ احد پر تشریف رکھتے تھے، اتنے میں احد لرزنے لگا، اور حضور ﷺ نے فرمایا، کہ ٹھہر جا، تیرے اوپر ایک نبی، ایک صدیق اور دو شہیدوں کے سوا کوئی نہیں ہے، اس پر پہاڑ ساکن ہو گیا''۔ اقبال نے حدیث سنتے ہی کہا کہ اس میں اچنبھے کی کونسی بات ہے؟ میں اس کو استعارہ و مجاز نہیں بالکل ایک مادی حقیقت سمجھتا ہوں اور میرے نزدیک اس کے لئے کسی تاویل کی حاجت نہیں۔ اگر تم حقائق سے آگاہ ہوتے تو تمہیں معلوم ہوتا کہ ایک نبی کے نیچے مادے کے بڑے سے بڑے تودے بھی لرزاٹھتے ہیں، مجازی طور پر نہیں، واقعی لرزاٹھتے ہیں''۔ ۵۳؎

ڈاکٹر جاوید اقبال اپنے والدِ ماجد کی اسی کیفیت کو یوں بیان کرتے ہیں:

''جاوید منزل'' میں اقبال کی زندگی سے متعلق چند یادیں راقم کے ذہن میں محفوظ ہیں ۔۔۔ انہی ایام میں ایک عرب بھی روزانہ اقبال سے ملنے آیا کرتے تھے۔ جو انہیں قرآن مجید پڑھ کر سناتے۔ راقم نے بھی ان سے چند ماہ قرآن مجید پڑھا ہے۔ وہ نہایت خوش الحان تھے۔ اقبال جب کبھی ان سے قرآن مجید سنتے، راقم کو بلوا بھیجتے اور اپنے پاس بٹھا لیتے۔ ایک بار انہوں نے سورہ مزمل پڑھی تو اقبال اتنا روئے کہ تکیہ آنسوؤں سے تر ہو گیا۔ جب وہ ختم کر چکے تو انہوں نے سر اٹھا کر راقم کی طرف دیکھا اور مرتعش لہجے میں بولے، تمہیں یوں قرآن پڑھنا چاہیئے۔

اسی طرح راقم کو ایک مرتبہ مسدس حالی پڑھنے کے لئے کہا، اور خاص طور پر وہ

بند...... جب قریب بیٹھے ہوئے میاں محمد شفیع نے دہرایا:

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا

تو اقبال سنتے ہی آبدیدہ ہو گئے۔ راقم نے سردار بیگم کی وفات پر انہیں آنسو بہاتے نہ دیکھا تھا، مگر قرآن مجید سنتے وقت، اپنا کوئی شعر پڑھتے وقت یا رسولِ کریم ﷺ کا اسمِ مبارک کسی کی نوکِ زبان پر آتے ہی ان کی آنکھیں امنڈ آیا کرتیں"۔ ۳۶

علامہ محمد اقبال کا نعتیہ کلام ان تمام کیفیات و احساسات کا ایک حسین گلستان ہے جو اپنے حسن و جمال مین یکتا ہے۔ چنانچہ "ترانۂ ملی" میں کہتے ہیں کہ آپ ﷺ ہمارے قافلے کے سالار ہیں۔ آپ ﷺ ہی کی بدولت ہمیں آرامِ جاں نصیب ہوا:

سالارِ کارواں ہے میرِ حجازؐ اپنا
اس نام سے ہے باقی آرام جاں ہمارا ۳۷

پھر "بال جبریل" کی ایک غزل میں کس خوبی سے کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ رشد و ہدایت کے آخری مینار ہیں، رسالت آپ ﷺ پر تمام ہوئی ہے اور آپ ﷺ ہی مولائے کل ہیں:

وہ دانائے سُبل، ختم الرسل، مولائے کل جس نے
غبارِ راہ کو بخشا فروغِ وادیِ سینا ۳۸

"اسرار خودی" میں نبی ﷺ کے ساتھ اپنی عقیدت و محبت کا اظہار کرتے ہوئے اسلام کے آفاقی اقدار کو بھی پیش کیا ہے:

۱۔ دردِلِ مسلم مقامِ مصطفیٰ است — آبروئے ما زنامِ مصطفیٰ است
۲۔ بوریا ممنونِ خوابِ راحتش — تاجِ کسریٰ زیرِ پائے امتش
۳۔ در شبستانِ حرا خلوت گزید — قوم و آئین و حکومت آفرید
۴۔ در جہاں آئینِ نو آغاز کرد — مسندِ اقوامِ پیشیں در نورد
۵۔ از کلیدِ دیں درِ دنیا کشاد — ہم چو او بطنِ امِ گیتی نزاد
۶۔ درنگاہِ او یکے بالا و پست — با غلامِ خویش بر یک خواں نشست
۷۔ آں کہ بر اعداء درِ رحمت کشاد — مکہ را پیغام "لا تثریب" داد
۸۔ ما کہ از قیدِ وطن بیگانہ ایم — چوں نگہ نور دو چشمیم و یکیم

ہستی مسلم تجلی گاہ اُو

طورہا بالد زگردِ راہِ اُو ۳۹؎

ا۔مسلمان کے دل میں آپ ﷺ کا مقام ہے۔آپ ﷺ ہی کے نام سے عزت وآبرو ہے۔

۲۔آپ ﷺ خوابِ راحت کے لئے بوریا پر آرام فرماتے (بوریا پر احسان فرماتے) او
آپ ﷺ کی امت نے ایران کے بادشاہ کسریٰ کا تاج اپنے پاؤں کے نیچے روند ڈالا۔

۳۔آپ ﷺ نے غارِ حرا میں خلوت گزینی اختیار فرمائی تو ایک نئی ملت ،ایک نیا آئین او
ایک نئی حکومت کو تشکیل دیا۔(یعنی بنی نوع انسان کے لئے اللہ کی جانب سے ،قرآن کی
صورت میں ایک نیا آئین اور حکومت کرنے کا نیا انداز لے کر آئے)

۴۔آپ ﷺ نے دنیا میں نیا آئین رائج کیا اور ملوکیت کی بالادستی کو ختم کیا۔(ایران وروم)

۵۔آپ ﷺ نے دین کی چابی سے دنیا کا دروازہ کھولا۔زمانے کے بطن سے آپ ﷺ جیس
کوئی بھی پیدا نہیں ہوا۔

۶۔آپ ﷺ کی نگاہ میں بالا و پست ایک ہی درجہ رکھتے تھے۔چنانچہ آپ ﷺ اپنے غلام کے
ساتھ ایک ہی دستر خوان پر بیٹھ کر کھانا کھایا کرتے تھے۔

۷۔آپ ﷺ نے اپنے دشمنوں کے لئے بھی رحمت کے دروازے کھول دیئے۔اور اہل مکہ
سے (فتح مکہ کے موقع پر) ''لاتثریب علیکم الیوم'' (آج کے دن تم سے کوئی بدلہ نہیں لیا جائے گا)
فرما کر معاف کر دیا۔

۸۔ہم وطن کی حد بندیوں سے آزاد ہیں۔ہم ایک ہیں۔اور دونوں آنکھوں کا نور ہیں۔یعنی
آنکھوں کے نور کی طرح یکساں ہیں۔

۹۔مسلمانوں کا وجود آپ ﷺ کی تجلی کا مقام ہے۔آپ ﷺ کی گردِ راہ سے کئی طور پیدا
ہوئے ہیں۔

''رموزِ بے خودی'' پر علامہ کو بہت ناز تھا۔ یہ کتاب ''عرضِ حال بحضور رحمۃ
للعالمین ﷺ'' کے ساتھ ختم ہوتی ہے لیکن یہ عرضِ حال درج ذیل اچھوتے نعتیہ اشعار سے
شروع کیا گیا ہے:

۱۔ اے ظہورِ تو شبابِ زندگی — جلوہ ات تعبیرِ خوابِ زندگی
۲۔ اے زمین از بارگاہت ارجمند — آسماں از بوسۂ بامت بلند
۳۔ شش جہت روشن ز تابِ روئے تو — ترک و تاجک و عرب ہندوئے تو
۴۔ از تو بالا پایۂ ایں کائنات — فقرِ تو سرمایۂ ایں کائنات

۱۔ اے وہ ذاتِ اقدس کہ اس جہانِ آب وگل میں آپ ﷺ کی تشریف آوری زندگی کا شباب ہے۔ آپ ﷺ کا جلوہ زندگی کے خواب کی تعبیر ہے۔
۲۔ اس زمین نے آپ ﷺ کی بارگاہ سے ارجمندی حاصل کی۔ آسمان بھی آپ ﷺ کی بارگاہ کو بوسہ دینے سے بلند ہوا۔
۳۔ آپؐ کے چہرۂ مبارک کے نور سے چھ اطراف (ساری دنیا) روشن ہیں۔ ترک، غیر ترک، عرب اور اہلِ ہنود آپؐ کے غلام ہیں۔
۴۔ آپ کی وجہ سے اس کائنات کا درجہ بلند ہوا۔ آپ کا فقر کائنات کا سرمایہ ہے۔
مزید عرضِ حال کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

در جہاں شمعِ حیات افروختی — بندگاں را خواجگی آموختی

آپؐ نے دنیا میں زندگی کی شمع جلائی اور غلاموں کو خواجگی سکھائی۔
اس عرضِ حال میں مسلمانوں کی دین سے غفلت شعاری اور لادینیت کی طرف ان کے رجحان کی فریاد اس طرح کرتے ہیں کہ ہر دردمند دل کو اپنا رونا رُلاتے ہیں:

۱۔ مسلم از سرِ نبیؐ بیگانہ شد — باز ایں بیت الحرم بتخانہ شد
۲۔ از منات و لات و عزّیٰ و ہبل — ہر یکے دارد بتے اندر بغل
۳۔ شیخِ ما از برہمن کافر تر است — زانکہ او را سومنات اندر سر است
۴۔ رختِ ہستی از عرب برچیدۂ — در خمستانِ عجم خوابیدۂ
۵۔ نعشش از پیشِ طبیباں بردہ ام — در حضورِ مصطفیؐ آوردہ ام
۶۔ مردہ بود از آبِ حیواں گفتمش — سرے از اسرارِ قرآں گفتمش
۷۔ محفل از شمعِ نوا افروختم
قوم را رمزِ حیات آموختم ۴۰

۱۔ مسلمان سر نبی ﷺ (حب نبی ﷺ) سے بیگانہ ہو گیا اور یہ بیت الحرام پھر سے بت خانہ ہو گیا۔
۲۔ ہر مسلمان اپنی بغل میں لات، منات، عزی اور ہبل میں سے کوئی نہ کوئی بت لئے ہوئے ہے۔
۳۔ ہمارا شیخ (دینی رہنما) برہمن سے زیادہ کافر ہے۔ اسلئے کہ اس کا سومنات (مندر) اس کے سر کے اندر ہے۔
۴۔ اس نے زندگی کا لباس عربوں سے اٹھالیا ہے اور (خود) عجم کے میکدہ میں غفلت کی نیند سو رہا ہے۔
۵۔ میں نے اس کی لاش کو طبیبوں کے سامنے سے اٹھایا اور حضورِ مصطفی ﷺ میں لے آیا ہوں۔
۶۔ میں نے عرض کیا یہ مردہ تھا۔ میں نے اس سے داروئے حیات یا آب حیات کی باتیں کی ہیں۔ میں نے اس سے قرآنِ پاک کے اسرار میں سے ایک راز بیان کیا ہے۔
۷۔ میں نے محفل کو آواز کی شمع سے روشن کیا اور امت مسلمہ کو زندگی کے رموز سکھائے۔

علامہ محمد اقبال زندگی کے آخری ایام میں فریضۂ حج ادا کرنا چاہتے تھے جسے وہ اپنی ناساز صحت کی وجہ سے انجام نہ دے سکے۔ مگر عالمِ تخیل میں مکہ معظمہ اور مدینہ منورّہ کا سفر کیا ہے اور اس سفر کے تاثرات فارسی اشعار میں قلمبند فرمائے ہیں۔ جو ان کی وفات کے بعد ''ارمغان حجاز'' کے فارسی حصہ میں شائع ہوئے۔

اس میں انہوں نے اپنے جذبات و احساسات، اپنی ملت اور اپنے معاشرہ کی دل گداز تصویر کھینچ کر رکھ دی ہے۔ اس کے دو حصے سفر حجاز سے متعلق ہیں پہلا ''حضور حق'' اور دوسرا ''حضور رسالت ﷺ''۔

حضور حق کی ایک رباعی درج ذیل ہے:

۱۔ بہ پایاں چوں رسد ایں عالمِ پیر
شود بے پردہ ہر پوشیدہ تقدیر
۲۔ مکن رسوا حضورِ خواجہ مارا
حسابِ من ز چشمِ او نہاں گیر ۱۴۱

۱۔ (اے رب العالمین) جب یہ بوڑھی دنیا خاتمے کو پہنچے اور ہر چھپی ہوئی تقدیر ظاہر ہو جائے۔ (یعنی روز قیامت آجائے اور ہر بندے کے پوشیدہ اعمال اس کے سامنے آجائیں)

۲۔ تو مجھے حضرت محمد ﷺ کی جناب میں رسوا نہ کرنا۔ میرا حساب ان کی نگاہ سے بچا کر لینا۔

پھر ''حضور رسالت ﷺ'' کے باب کی ابتدا عزت بخاری کے وفورِ شوق و عقیدت سے سرشار مندرجہ ذیل شعر سے کرتے ہیں:

ادب گاہیست زیر آسماں از عرش نازک تر
نفس گم کردہ می آید جنیدؒ و بایزیدؒ اینجا ۴۲

یعنی حضرت محمد مصطفی ﷺ کا شہر مدینہ یا روضہ مبارک ایک ایسی ادب گاہ ہے جہاں حضرت جنید بغدادیؒ اور حضرت بایزید بسطامیؒ جیسے ولی بھی سانس کو گم کیے ہوئے آتے ہیں (کہ کہیں سانس لینا بھی بے ادبی میں شامل نہ ہو جائے)۔

''حضورِ حق'' میں شاعر نے غیر معمولی آزادی برتی ہے۔ لیکن ''حضور رسالت ﷺ'' میں ان کا لہجہ بدل گیا ہے۔ جذب و شوق اور درد و کرب میں اضافہ ہو گیا ہے۔ غیر معمولی آزادی کی جگہ احترام و نیاز مندی نے لے لی ہے۔ چنانچہ یہ روحانی سفر لکھتے وقت ان کی عمر ساٹھ سال سے زیادہ تھی اور ان کے قویٰ مضمحل ہو گئے تھے۔ اس حال میں کہتے ہیں:

۱۔ بایں پیری رہِ یثرب گرفتم   نواخواں از سرورِ عاشقانہ
۲۔ چو آں مرغے کہ در صحرا سرِ شام   کشاید پر بہ فکرِ آشیانہ ۴۳

۱۔ میں نے اپنے بڑھاپے کی اس عمر میں یثرب (مدینہ منورہ) کی راہ اختیار کی۔ عاشقانہ گیت کی نوا پیدا کرتے ہوئے اس کے سرور میں چلا جا رہا ہوں۔

۲۔ میں اس پرندے کی طرح ہوں جو صحرا میں شام کے وقت اپنے گھونسلے کی فکر میں اڑنے کے لئے پر کھولتا ہے۔

جب ذوق و شوق کے ساتھ یہ کارواں درود و سلام پڑھتے ہوئے مدینہ منورہ کی طرف رواں دواں ہو جاتا ہے تو اس سرور و کیف کی فضا میں وہ کہتے ہیں:

۱۔ چہ خوش صحرا کہ در وے کارواں ہا   درودے خواند و محمل براند
۲۔ بریگ گرمِ او آور سجودے   جبیں را سوز تا داغے بماند ۴۴

۱۔ مدینے کے راستے کا صحرا کتنا اچھا ہے جس میں مدینے کے راہی درود پڑھتے جاتے ہیں اور

اونٹوں کو ہانکتے جاتے ہیں۔
۲۔ اس صحرا کی گرم ریت پر سجدے کر اور ماتھے کو ریت کی گرمی سے جلاتا کہ اس پر داغ رہ جائے۔

یہ بات غور طلب ہے کہ شاعر یہاں بھی سب سے پہلے امت مسلمہ کی زبوں حالی کا ذکر کرتا ہے:

۱۔ چہ گویم زاں فقیرے دردمندے　　مسلمانے بہ گوہر ارجمندے
۲۔ خدا ایں سخت جاں را یار بادا　　کہ افتاد است از بام بلندے ۴۵

۱۔ میں اس دردمند فقیر یعنی مسلمان کے متعلق کیا کہوں جس کی ذات کا گوہر بڑا قیمتی ہے۔
۲۔ خدا اس سخت جان کا مددگار ہو جو بہت بلند چھت سے گرا ہے۔ یعنی صدیوں تک انتہائی عروج پر رہنے کے بعد اب انتہائی پستی میں گرا ہوا ہے۔

پھر بڑے درد کے ساتھ کہتے ہیں:

۱۔ فقیرم از تو خواہم ہر چہ خواہم　　دل کوہے خراش از برگِ کاہم
۲۔ مرا درس حکیماں دردِ سر داد　　کہ من پروردۂ فیضِ نگاہم ۴۶

۱۔ میں تو صرف آپ کے در کا فقیر ہوں۔ میں جو کچھ چاہتا ہوں آپ ﷺ ہی سے چاہتا ہوں۔ میرے گھاس کے تنکے سے پہاڑ کے دل میں خراش پیدا کر۔
۲۔ مجھے اہلِ خرد نے دردِ سر دیا ہے۔ میں تو بس آپ ہی کی فیض نگاہ کا پروردہ ہوں۔ ۴۶

علامہ مرحوم کی ایک اور اچھوتی نعت "درحضور رسالت مآب ﷺ" ہے۔ اس کا تعارف پہلے ہی کیا جا چکا ہے۔

البتہ موقع کی مناسبت سے اس نعت کے چند شعر پیش کئے جاتے ہیں:

۱۔ شہسوارا! یک نفس درکش عناں　　حرف ما آساں نیاید بر زباں
۲۔ آرزو آید کہ ناید تا بلب؟　　می نہ گردد شوق محکومِ ادب
۳۔　　آں بگوید لب کشا اے دردمند
　　ایں بگوید چشم بکشا لب بہ بند ۴۷

۔علامہ مرحوم رسولِ رحمت ﷺ کو شہسوار کے لقب سے پکارتے ہوئے التماس کرتے ہیں:
اے شہسوار خدارا ازرادیر کے لئے رکاب بوسی کا موقع عنایت فرمائے۔ میری بات میرے لبوں تک نہیں آرہی ہے۔ یعنی میرا ناطقہ سر بگریباں ہے۔
۲۔ میری آرزو نہ جانے لبوں تک آتی ہے یا نہیں۔ کہیں میرا شوق، ادب کا محکوم نہ بن جائے۔
۳۔ آرزو کہتی ہے کہ اے دردمند لب کھول اور قوّتِ گویائی پیدا کر اور ادب کہتا ہے کہ آنکھ کھول اور لب بند رکھ۔
اس مختصر مقالہ میں دو عبقری شاعروں کی نعتیہ شاعری کا محاکمہ کرنا دریا کو کوزے میں بند کرنے کے مترادف ہے۔ مگر اس تجزیہ سے چند اہم نکات ہمارے سامنے آئے ہیں۔
(i) دونوں شاعر حضور ﷺ کی ذات اقدس سے بے انتہا وارفتگی اور والہانہ عقیدت و محبت سے سرشار ہیں،
(ii) امت مسلمہ کی زبوں حالی پر خون کے آنسو، بہاتے ہیں اور دین سے غفلت شعاری برتنے پر ماتم کرتے ہیں،
(iiii) پھر درد و کرب کے عالم میں فریاد بھی کرتے ہیں۔

☆☆☆☆☆

حوالہ جات

۱۔ندوی، ڈاکٹر عبداللہ عباس،عربی میں نعتیہ کلام،لکھنو،مکتبہ اسلام،۲۰۰۵ء،ص ۲۷-۳۱۔

۲۔ایضاً،ص ۳۲-۳۷۔

بحوالہ ابن ہشام، سیرۃ النبی،ض ا،ص ۲۱۳،

الروض الانف،ج ۲،ص ۵۵،

البدایۃ والنھایۃ،ج ۳،ص ۲۲۴۔

۳۔عربی میں نعتیہ کلام،ص ۴۶-۴۳۔

بحوالہ ابن ہشام،ج ۲۔

البدایۃ والنھایۃ،ج ۲

۴۔عربی میں نعتیہ کلام،ص ۵۲۔

ایضاً،ص ۴۹-۵۲۔

۵۔زیات، استاذ احمد حسن،تاریخ ادب عربی، ترجمہ از عبدالرحمٰن طاہر سورتی، نئی دہلی، قاری پبلیکیشنز، ۲۰۰۴ء ص ۱۱۸-۱۲۱۔

الدکتور أحمد محمد الحوفی ،الإسلام فی شعر شوقی،القاہرۃ،المجلس الأعلی للشعون الاسلامیۃ، ۱۹۶۲ء،ص ۳۵-۳۶۔

مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیں:

الدکتور زکی المحاسنی،الأدب الدینی، القاہرۃ،مکتبۃ الانجلو المصریۃ،۱۹۷۰ء،ص ۴۸

۶۔مقتدی حسن ازہری،تاریخ ادب عربی حصہ دوم، بنارس، ادارۃ البحوث الاسلامیۃ والدعوۃ والافتاء بالجامعۃ السلفیۃ،۱۹۸۱ء،ص ۳۵-۳۷۔

ندوی، ڈاکٹر عبدالحلیم،عربی ادب کی تاریخ، جلد دوم،نئی دہلی،قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان،۲۰۰۴ء (ص ۱۶۱-۱۶۹) ص ۱۶۱-۱۶۹۔

عربی میں نعتیہ کلام،ص ۵۳-۶۵۔

۷۔مولانا ذوالفقار دیوبندی،شرح بانت سعاد، دیوبند، کتب خانہ رحیمیہ،۱۹۶۷ء،ص ۵۔

ایضاً،ص ۴۱-۴۲۔

۸۔الأدب الدینی،ص ۱۲۶-۱۲۷۔

۹۔عربی میں نعتیہ کلام،ص ۷۲۔

عربی ادب کی تاریخ، جلد دوم،ص ۱۵۹-۱۶۰

۱۰۔ ایضاً ص ۱۵۱۔

۱۱۔ عربی میں نعتیہ کلام، ص ۷۵۔

۱۲۔ ایضاً ص ۵۸-۶۵۔

۱۳۔ الشیخ ابراھیم الباجوری، شرح البردة للإمام البوصیری، القاھرة، میدان الأوبرا۔ ۱۲۹۶ء

عربی میں نعتیہ کلام، ص ۱۳۲-۱۲۹۔

عربی ادب کی تاریخ، جلد دوم ص ۱۵۱-۱۵۲

دکتور شوقی ضیف، تاریخ الأدب العربی، الجزء ٦، القاھرة، دار المعارف- ۱۱۱۹ کنورنیش النیل، ۱۹۷۴ء، ص ۳۶۱-۳۶۵۔

۱۴۔ عربی میں نعتیہ کلام، ص ۲۳۴-۱۳۹۔

۱۵۔ الشوقیات لأمیر الشعراء أحمد شوقی، الجزء الأول، بیروت، دار الکتاب العربی، ۲۰۰۸ء، ص ۱۵۳-۱۶۸۔

خاص طور پر، ص ۱۶۱۔

۱۶۔ ڈاکٹر جاوید اقبال، زندہ رود، لاہور، اقبال اکادمی پاکستان، ۲۰۰۴ء

۱۷۔ کلیات اقبال (فارسی)، لاہور، عثمان پبلی کیشنز، ص ۱۲۱۷

۱۸۔ عربی میں نعتیہ کلام، ص ۷-۸

۱۹۔ الشوقیات لأحمد شوقی، الجزء الأول، مصر، المکتبة التجاریة الکبری، ۱۹۸۳ء، ص ۳۴-۳۷

۲۰۔ الإسلام فی شعر شوقی، ص ۴۱۔

الشوقیات لأمیر الشعراء أحمد شوقی، الجزالأول، راجعه و ضبطه، د۔ یوسف الشیخ محمد البقاع، بیروت، دار الکتاب العربی، ۲۰۰۷ء، ص ۱۵۳-۱۶۸

فوزی عطوی، أحمد شوقی أمیر الشعراء بیروت، الشرکة اللبنانیة، ۱۹۶۹ء، ص ۲۱۰-۲۳۲۔

۲۱۔ عربی میں نعتیہ شاعری، ص ۱۴۰۔

۲۲۔ الإمام البُوصیری، البُردة، القاھرة، مکتبة الآداب، میدان الأوبرا، ۱۸۵۷ء، ص ۴۔

۲۳۔ الشوقیات، الجزالأوّل، ص ۱۵۳۔

۲۴۔الإسلام فی شعر شوقی،ص۴۳

مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیں:

زکی مبارك، الموازنة بين الشعراء، بيروت، منشورات المكتبة المعرّية،۱۹۳۶ءص۱۵۰-۱۶۳

فوزی عطوی، أحمد شوقی أمیرالشعراء، بیروت، الشرکة اللبنانیة للکتاب ،۱۹۶۹ء،

ص۱۶۲-۱۶۳

۲۵۔عربی میں نعتیہ کلام،ص۲۷۵۔

۲۶۔الشوقیات، الجزالأوّل،ص۱۵۶

۲۷۔ایضاً،ص۱۵۷

۲۸۔ایضاً،ص۱۶۱

۲۹۔الإاسلام فی شعر شوقی،ص۴۱-۴۴۔

۳۰۔مذکورہ عبارت راقم الحروف کے ایک مقالہ ''شوقی اور اقبال'' سے ماخوذ ہے جو سالنامہ ''اقبالیات'' شمارہ-۲۲، اقبال انسٹی ٹیوٹ آف کلچر اینڈ فلاسفی، کشمیر یونیورٹی،۲۰۱۳ء میں چھپ چکا ہے۔ص۲۴۲-۲۴۳۔

۳۱۔الشوقیات، الجزء الأوّل،ص۵۷-۵۸۔

۳۲۔ایضاً،ص۳۳۔

۳۳۔ایضاً،ص۳۳۔

۳۴۔دکتور ماھرحسن فھمی، شوقی شعرہ الإسلامی، القاھرہ، دارالمعارف بمصر،۱۹۵۳ءص۴۷

۳۵۔ندوی،عبدالسلام،اقبال کامل،اعظم گڑھ،دارالمصنفین ،۱۹۴۸ء،ص۶۳-۶۴۔

۳۶۔ایضاًص۶۵-۶۶۔

۳۷۔ڈاکٹر جاوید اقبال،زندہ رُود، لاہور،اقبال اکادمی پاکستان،سنگ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۴ء ص۶۷۲-۶۷۳۔

۳۸۔کلّیاتِ اقبال دہلی،مرکزی مکتبہ اسلامی،۱۹۹۴ءص۱۳۲۔

۳۹۔ایضاًص۲۶۱۔

۴۰۔ کلیاتِ اقبال، (فارسی)، لاہور، عثمان پبلی کیشنز، ۲۰۰۶ء، ص ۲۴۷-۲۴۹۔

۴۱۔ ایضاً، ص ۴۷۵-۴۷۶۔

۴۲۔ ایضاً، ص ۷۳۰۔

۴۳۔ ایضاً، ص ۷۳۰۔

۴۴۔ ایضاً، ص ۷۳۱۔

۴۵۔ ایضاً، ص ۷۳۳۔

۴۶۔ ایضاً۔ ص ۷۳۷۔

۴۷۔ ایضاً، ص ۷۵۰۔

☆☆☆☆☆

باب ہفتم

شوقی اور اقبال

کا

تصوّرِ خلافت

خلافت

خلافت کے وسیع موضوع پر کچھ لکھنے سے پہلے اسلام کے نظریہ حاکمیت کو ذہن نشین کرنا ضروری ہے۔اس سلسلے میں قرآن کریم سے واضح ہوتا ہے کہ فیصلہ کرنے کا اختیار اور فرماں روائی کا حق صرف اللہ سبحانہ و تعالی کے لئے خاص ہے۔سروری اسی ذاتِ بے ہمتا کو زیبا ہے۔وہی اصل حکمران ہے۔اس کے حدودِ حکومت میں نہ کوئی قیصر ہے نہ کسریٰ۔اسی کا حکم عرش سے فرش تک اور آسمان سے زمین تک جاری ہے۔

وَهُوَ الَّذِی فِی السَّمَاءِ إِلٰهٌ وَفِی الْأَرْضِ إِلٰهٌ سورة الزخرف: ٨٤

وہی ایک آسمان میں بھی خدا ہے اور زمین میں بھی خُدا۔ ١

حاکمیت کا یہ تصور اسلام کے امّہات العقائد میں سے ایک بنیادی عقیدہ ہے اور بعثت نبوی ﷺ سے آج تک جمہور علماء اور فقہاء کا اس پر اتفاق ہے کہ محض تکوینی حاکمیت ہی نہیں بلکہ سیاسی حاکمیت بھی اللہ ہی کے لئے خاص ہے اور اس میں کوئی اس کا شریک نہیں۔

اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ط اَمَرَ اَنْ لَّا تَعْبُدُوْا اِلَّا اِيَّاهُ ط ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ ط وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ○ سورة یوسف: ۴۰۔

اقتدار صرفِ اللہ ہی کا ہے۔اس نے حکم دیا کہ اس کے سوا کسی کی پرستش نہ کرو۔یہی دینِ قیم ہے۔لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔ ٢

اور یہ کہ اللہ ہی مختارِ مطلق ہے۔

وَاِنَّ رَبَّكَ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ سورة ھود: ۱۰۷۔

تیرا رب پورا اختیار رکھتا ہے کہ جو چاہے کرے۔ ٣

سیّد مودودی اردوئے مُبین میں اس موضوع کی وضاحت فرماتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ”جو خدا اس کائنات پر فرمانروائی کر رہا ہے وہ ایک طرف تو ایسا کامل اقتدار رکھتا ہے کہ زمین سے لے کر آسمانوں تک کوئی اس کے فیصلوں کو نافذ ہونے سے روک نہیں سکتا، مگر دوسری طرف وہ حکیم بھی ہے، اس کا ہر فیصلہ سراسر دانائی پر مبنی ہوتا ہے۔علیم بھی ہے، جو فیصلہ بھی کرتا ہے ٹھیک

ٹھیک علم کے مطابق کرتا ہے۔ رحیم بھی ہے، اپنے بے پناہ اقدار کو بے رحمی کے ساتھ استعمال نہیں کرتا۔ غفور بھی ہے، اپنے زیر دستوں کے ساتھ خوردہ گیری کا نہیں بلکہ چشم پوشی و درگزر کا معاملہ کرتا ہے۔ وہاب بھی ہے، اپنی رعیت کے ساتھ بخیلی کا نہیں بلکہ بے انتہا فیاضی کا برتاو کر رہا ہے اور حمید بھی ہے، تمام قابل تعریف صفات و کمالات اس کی ذات میں جمع ہیں۔'' ۴

قرآنِ کریم سے واضح ہوتا ہے کہ اصل دینِ الٰہی ایک ہی ہے اور وہ اسلام ہے۔

إِنَّ الدِّيْنَ عِندَ اللَّهِ الْإِسلام ط سورۃ ال عمران: ۱۹

اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے۔ ۵

اور اسلام سلطنت اور دین کا حسین امتزاج ہے۔ بقول سیّد سلیمان ندوی کہ ''وہ ایسی سلطنت ہے جو ہمہ تن دین ہے یا ایسا دین جو سرتا پا سلطنت ہے مگر سلطنتِ الٰہی''۔ ۶

یعنی ایسی سلطنت جس کا احکم الحاکمین صرف اللہ سبحانہ وتعالیٰ ہے۔

قرآن ہمیں اس حقیقت سے بھی آگاہ کرتا ہے کہ انسان اس دنیا میں اللہ کا خلیفہ ہے ۷۔ سیّد مودودی نے (تفہیم القرآن جلد اول ص ۶۲) خلیفہ کی تشریح یوں کی ہے کہ ''جو کسی کی ملک میں اس کے تفویض کردہ اختیارات اس کے نائب کی حیثیت سے استعمال کرے۔ خلیفہ مالک نہیں ہوتا بلکہ اصل مالک کا نائب ہوتا ہے۔ اس کے اختیارات ذاتی نہیں بلکہ مالک کے عطا کردہ ہوتے ہیں۔ وہ اپنے منشا کے مطابق کام کرنے کا حق نہیں رکھتا بلکہ اس کا کام مالک کے منشا کو پورا کرنا ہوتا ہے۔ اگر وہ خود اپنے آپ کو مالک سمجھ بیٹھے اور تفویض کردہ اختیارات کو من مانے طریقے سے استعامال کرنے لگے یا اصل مالک کے سوا کسی اور کو مالک تسلیم کر کے اس کے منشا کی پیروی اور اس کے احکام کی پیروی کرنے لگے تو یہ سب غداری اور بغاوت کے افعال ہوں گے''۔ ۸

''آنحضرت ﷺ اس دین کے سب سے آخری داعی، نبی اور رسول تھے اور وہی اس سلطنت کے سب سے پہلے امیر، حاکم اور فرمانروا تھے''۔ ۹

عہد خلافت

نبی اکرم ﷺ نے اپنی مدنی زندگی کے دس سال کے عرصے میں اسلام کے آفاقی اصولوں پر مبنی ایک بے مثال اسلامی ریاست کو تشکیل دیا۔

آپ ﷺ کے بعد خلفائے راشدین رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے منصب خلافت کو اس حسن وخوبی سے انجام دیا جو رہتی دنیا تک ساری انسانیت کے لئے قابل تقلید نمونہ ہے۔ اسلئے کہ:۔

(ا) وہ اللہ کی کتاب (القرآن الکریم) اور اس کی شریعت کے پابند تھے۔ اللہ کی کتاب کی روشنی میں وہ اپنی منزل کی طرف گامزن رہے اور احکام شریعت کے مطابق لوگوں کے فیصلے کئے۔ ایسے ہی پاک نفوس کے بارے میں ارشاد ربانی ہے:

أَوَ مَنْ كَانَ مَيْتاً فَأَحْيَيْنَاهُ وَ جَعَلْنَا لَهُ نُوراً يَمْشِي بِهِ فِي النَّاسِ كَمَنْ مَثَلُهُ فِي الظُّلُمَاتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِنْهَا ○ سورۃ الانعام:۱۲۲

کیا وہ شخص جو پہلے مردہ تھا پھر ہم نے اسے زندگی بخشی اور اس کو روشنی عطا کی جس کے اجالے میں وہ لوگوں کے درمیان زندگی کی راہ طے کرتا ہے۔ اُس شخص کی طرح ہو سکتا ہے جو تاریکیوں میں پڑا ہوا اور کسی طرح ان سے نہ نکلتا ہو۔ ۱۰

مزید یہ کہ:

يَـٰٓأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ لِلّٰهِ شُهَدَاءَ بِالْقِسْطِ ز وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَىٰٓ أَلَّا تَعْدِلُوا ط اِعْدِلُوا قف هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ط إِنَّ اللّٰهَ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ ○ سورۃ المائدۃ:۸

(اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ کی خاطر راستی پر قائم رہنے والے اور انصاف کی گواہی دینے والے بنو۔ کسی گروہ کی دشمنی تم کو اتنا مشتعل نہ کردے کہ انصاف سے پھر جاو۔ عدل کرو، یہ خدا ترسی سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔ اللہ سے ڈر کر کام کرتے رہو، جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے پوری طرح باخبر ہے۔ ۱۱

(ii) وہ ایک طویل عرصہ تک حضور ﷺ کی صحبت و تربیت میں رہے۔ آپ ﷺ نے انہیں زہد و ورع اور عفاف و امانت کی تعلیم دی۔ انہیں تزکیہ و ادب سے آراستہ و پیراستہ کیا۔ اللہ کی بارگاہ میں بازپرس کی فکر ہمیشہ ان کے دامن گیر رہتی تھی۔ ان کے کانوں میں ہر آن یہ الہامی صدا گونجتی رہتی تھی:

تِلْكَ الدَّارُ الْآخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِينَ لَا يُرِيدُونَ عُلُوّاً فِي الْأَرْضِ وَلَا فَسَاداً

وَالعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ۝ سورۃ القصص: ۸۳
وہ آخرت کا گھر تو ہم ان لوگوں کے لئے مخصوص کر دیں گے جو زمین میں اپنی بڑائی نہیں چاہتے اور نہ فساد کرنا چاہتے ہیں اور انجام کی بھلائی متقین ہی کے لئے ہے۔ ۱۲

یہی وجہ ہے کہ ان کے سامنے خدا پرستی، انسان دوستی اور آخرت پسندی کا تصور غالب رہتا تھا۔

(iii) قومیت، وطنیت اور لسانی عصبیت ان کے سامنے ایک حقیر اور بے معنی چیز تھی۔ وہ جب خلیفہ بنے تو نیابتِ الٰہی اور خدمتِ خلق کے جذبہ کے تحت اپنا فریضہ انجام دیا۔

(iv) چونکہ انسان کا وجود روح اور جسم (مادہ) کا مرکب ہے۔ ان دونوں حیثیتوں کو مدنظر رکھ کر انہوں نے اعتدال سے کام کیا۔ نہ وہ بوالہوس کی طرح دنیا پر جھپٹے اور نہ راہبوں کی طرح اس سے کنارہ کشی اختیار کی۔ بلکہ اسے ایک اعلیٰ تر اور ارفع تر مقصد کے لئے استعمال کیا۔

ان جمیع اوصافِ حمیدہ کے علاوہ یہ پاک نفوس خلفاء اخلاق و دیانت، تدبّر و فراست اور قوت و سیاست کے جامع تھے۔ ۱۳

یہی طرزِ حکومت دراصل اللہ کی نیابت ہے اور اسلامی امیر اس کا خلیفہ یا نائب کی حیثیت رکھتا ہے۔ سیّد سلیمان ندوی اس کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

''وہ ایک ایسا طرز حکومت جو محمد رسول اللہ ﷺ ہی کے ذریعہ ظہور میں آیا اور اسلام ہی نے اس کو پیش کیا ہے۔ وہ نہ اوتاری ہے نہ شخصی ہے۔ نہ دستوری ہے نہ جمہوری ہے اور نہ زعیمی ہے، بلکہ ایک ایسا طرز حکومت ہے جس میں ان سب کے خصوصیات و فضائل تو یکجا ہیں لیکن وہ اِن کے قبائح و مثالب سے خالی ہیں۔'' ۱۴

یہ دور خلافت اور نظام حکومت پورے تیس سال تک قائم رہا اور عالمِ انسانیت کو داروئے حیات سے نوازتا رہا۔ اس کے ثمرات غیر معمولی تھے۔ لیکن اس کے بعد اس منصبِ جلیل پر ایسے لوگ حاوی ہو گئے جو خلفاء نہیں بلکہ ملوک تھے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز کی ذات کو مستثنیٰ کر کے خلفائے بنی امیہ اور بنی عباس نام کے خلفاء تو تھے مگر حقیقت میں وہ ملوک تھے۔ پھر تاتاری حملے نے اس کی رہی سہی کسر پوری کر دی۔ لیکن اسلامی تعلیمات کے اعجاز اور واعظین اسلام نے اس فاتح قوم کو مفتوح کر دیا اور انہوں نے اسلامی تعلیمات کے سامنے گھٹنے ٹیک

دے اور مسلمان ہو گئے۔ پروفیسر آرنالڈ اپنی کتاب (Preaching of Islam) ''اشاعت اسلام'' میں لکھتے ہیں:

''لیکن اسلام اپنی گذشتہ شان وشوکت کے خاکستر سے پھر اٹھا اور واعظین اسلام نے ان ہی وحشی مغلوں کو جنہوں نے مسلمانوں پر کوئی ظلم باقی نہ رکھا تھا، مسلمان کر لیا''۔ ۱۵

علامہ محمد اقبال نے اس تاریخی حقیقت کو اپنے انوکھے شعر میں بیان کیا ہے:

ہے عیاں یورشِ تاتار کے افسانے سے
پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے

بانگ درا، ص ۲۰۶ وکلیات اقبال (اردو) ص ۲۰۶

مگر ان کی حکمرانی بھی خلافت نہیں بادشاہت تھی۔

''جس کے نتیجہ میں اسلام کا تصورِ اقتدار و حکمرانی، اصولِ عدل وانصاف، ضابطہ عدالت و فوجداری اور قوانین سیاست و جہانبانی اور صفاتِ خداوندی کی مکمل توضیحات وتشریحات اب بھی عوام کے سامنے نہ آسکیں اور یوں کہنا چاہئے کہ اسلام کا عالمگیر وآفاقی تصور اور خدائے ذوالجلال کی سیاسی حاکمیت، کامل اطاعت وفرماں روائی، الٰہیت وربوبیت اور دین وعبادت کا مکمل قرآنی مفہوم بادلوں کی اوٹ میں چھپا رہا''۔ ۱۶

پھر ۱۴۵۳ء میں عثمانی ترکوں نے مسلم بلاک کی قیادت کو سلیقے سے سنبھالا جب سلطان محمد فاتح نے بازنطینی ریاست کے ناقابلِ تسخیر دارالسلطنت قسطنطنیہ کو فتح کیا۔ مؤرخین لکھتے ہیں کہ اس فتح سے ایوانِ صلیب کی دیواریں لرزہ براندام ہو گئیں۔

''سلطان محمد فاتح سے یورپ اس قدر مرعوب تھا کہ اس کے انتقال پر پاپائے اعظم نے جشنِ مسرّت منانے اور تین روز تک مسلسل شکرانے کی نماز ادا کرنے کا حکم دیا۔ عثمانی قوم ایک بلند حوصلہ، پرجوش اور زندہ قوم تھی۔ اس میں سادگی وبدویت کی ساری صفات موجود تھیں۔ وہ جذبۂ جہاد وشہادت سے سرشار تھے۔ ان کے پاس اسلام کے مادّی وروحانی تسلّط کو پھیلانے کے لئے کافی جنگی طاقت موجود تھی۔ بین الاقوامی قیادت کے لئے ان کو بہترین جغرافیائی مرکز حاصل تھا۔ وہ علم وفن کے میدان میں پیش قدمی کر کے یورپ کی عیسائی قوموں کے چھکے چھڑا سکتے تھے''۔ ۱۷

لیکن

"ترکوں کی بدقسمتی سے زیادہ مسلمانوں کی حرماں نصیبی ہے کہ عین ترقی وعروج کے زمانے میں ترکوں میں تنزل وانحطاط شروع ہوگیا اور قوموں کے پرانے امراض ان میں پیدا ہوگئے۔" ۱۸ اس کی وجہ سے مسلمانوں میں علمی جمود اور فکری انحطاط شروع ہوگیا۔ جبکہ اسی دوران یورپ خوابِ غفلت سے بیدار ہو رہا تھا اور وہ سالوں کا سفر گھنٹوں میں اور صدیوں کا سفر سالوں میں طے کرنے لگا۔ اس نے زندگی کے ہر میدان میں عبقری شخصیتوں کو پیدا کیا۔ اس طرح اس تہذیب نے عروج حاصل کرنے کے بعد عالم اسلام کی طرف للچائی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ ۱۹

ان کے سامنے سب سے بڑی رکاوٹ عثمانی خلافت تھی جو اپنی تمام تر کمزوریوں کے باوجود امت مسلمہ کے درمیان اتحاد و یگانگت کا ایک رمز تھی۔ اس کو ہٹانے اور مسلمانوں کے اتحاد کو توڑنے کے لئے ان مغربی شاطروں نے پہلے عربوں میں عثمانیوں کے خلاف بہت زیادہ پروپاگنڈا کیا۔ بقول علامہ شبلی نعمانی کے کہ: "یورپین لٹریچر پڑھ کر ترکوں کی نسبت تحقیر کے خیالات نہ پیدا ہونا، بعینہ ایسا ہے جیسا خواب آور دوا کھا کر نیند کا نہ آنا"۔ ۲۰ دوسری طرف انہوں نے عربوں میں عرب قومیت کا نغمہ الاپا۔ انہیں عربوں میں میر جعفر اور میر صادق جیسے غدار آسانی سے مل گئے۔ جو عرب قومیت کے نشے میں سرشار تھے، جنہوں نے خلافت کے بجائے بادشاہت کو ترجیح دی۔ برطانیہ نے انہیں جنگی ساز وسامان، ذخائر اور فوجی افسر فراہم کئے۔ اسی دوران جنگ عظیم اول (۱۹۱۴ء-۱۹۱۸ء) بپا ہوگئی۔ یورپی اتحادی عربوں کو اپنانے میں کامیاب ہوگئے۔ پہلے انہیں ۱۹۱۶ء میں ترکوں کے خلاف لڑوایا۔ پھر آپس میں لڑوایا اور اس کے بعد اپنا ترنوالہ بنایا۔ ہندوستان میں بھی یورپی سامراج کا یہی طریقہ کار رہا۔ (اس پر پہلے ہی تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے) اسی کے ساتھ ۱۹۱۹ء میں خلافت اور عثمانی سلطنت کا بھی خاتمہ ہوگیا۔ یہ ساری کامیابیاں یورپی سامراج نے مسلمانوں کو قومیت، وطنیت اور اقلیمیت کی شراب پلا کر حاصل کرلیں۔ اس سے مسلمان اسلامیت کو چھوڑ کر اسلامی تعلیمات سے منہ موڑ کر قومیت، وطنیت اور اقلیمیت کے نشے میں مست و مدہوش ہوگئے اور انہوں نے خلافت کے بجائے ملوکیت کو ترجیح دی۔ اس طرح ان کا اتحاد پارہ پارہ ہوگیا۔ نتیجتاً وہ یورپ کے غلام بن گئے۔ ۲۱

امت مسلمہ کی اس پسپائی اور اپنی کامیابی پر ان استعماری طاقتوں کے حوصلے اور زیادہ بلند ہو گئے۔ چنانچہ ان کے بـاحثیـن اور مستشرقین کے حوصلے اور زیادہ بلدن ہو گئے۔ انہوں نے اسلام پر طرح طرح کے حملے شروع کیے اور اس مین دریدہ ذہنی سے بھی کام لیا۔ اس میں ان کا ساتھ بعض یورپ سے تعلیم پا کر آنے والوں نے بھی دیا۔ وہ ان کے شارح اور داعی بن گئے۔ انہوں نے اپنا زورِ قلم اسی کام پر صرف کیا۔

"مثلاً قرآن مجید کا انسانی تعبیر کا نتیجہ ہونا، دین وسیاست کی تفریق، اسلام کی نظام حکومت سے بے تعلقی اور اس کا محض ایک اعتقادی، اخلاقی اور عباداتی نظام ہونا، سیکولرزم کی دعوت، عربی زبان وادب کے اولین مآخذ (شعر جاہلی کی صحت وثبوت سے انکار، حدیث کی حجیت اور سنت کی صحت کا انکار یا تشکیک، عورتوں کی آزادی اور مردوں کے ساتھ مساواتِ کلی اور بے پردگی کی تلقین وتحریک، اسلامی فقہ کو رومن لا سے ماخوذ اور اس کی اسپرٹ سے متاثر قرار دینا، قدیم تہذیبوں کے احیاء کا نعرہ عہد فرعونی کی تقدیس، اس کی تہذیب، ادب اور کارناموں پر فخر، مقامی عامی زبان میں تصنیف وتالیف اور لاطینی حروف کو اختیار کرنے کی دعوت، مغربی قانون واصول کی بنیاد پر قانون سازی اور عربی قومیت اور مادّی سوشلزم، اور بعض وقت مارکسی کمیونزم کی دعوت (جو حال میں زیادہ نمایاں ہو گئی ہے) ان سب چیزوں میں مغربی فکر بلکہ مغربی طرز ادا اور تعبیر تک کے گھنے سائے آپ کو اہلِ عرب کے دماغوں اور ان کی تحریروں پر اپنے بازو پھیلائے ہوئے نظر آئیں گے، وہ اس پر اس طرح چھا گئے جس طرح بڑے درخت نوخیز پودوں کو اپنے سایہ میں لے لیتے ہیں، مغربی فکر کا عکس ان پر اس طرح پڑتا نظر آتا ہے جس طرح کسی صاف وشفاف آئینہ میں آفتاب کا عکس"۔ ۲۲

ہمارے زیر بحث دونوں شاعروں نے ان تمام حقائق کا عینی مشاہدہ کیا، اس فکر وادب کا بغائر مطالعہ کیا۔ (یورپ میں بھی اور اپنے یہاں بھی) پھر اسلامی شریعت کے اصولوں سے پرکھ کر ان کا بروقت اور برمحل جواب بھی دیا۔ امت مسلمہ کو وحدتِ اسلامی کی طرف دعوت دی۔ اس کے لئے قرآن اور صاحب قرآن ﷺ کے بعد خلافت کو ان دونوں عبقری شاعروں نے اپنی شاعری کا ایک اہم اور ممتاز موضوع بنایا۔

شوقی اور تصورِ خلافت

شوقی کا ایمان ہے کہ اسلام اللہ کا دین اور مکمل ضابطہ حیات ہے۔ اس میں دین وسیاست کوئی تفریق نہیں بلکہ اسلام، دین وسیاست، تہذیب ومعاشرت اور تمدن وثقافت کا مکمل دستوار العمل ہے۔ اجتماعی زندگی میں اس دستور اور آئین کا نفاذ اسلامی حکومت ہی کرے جس کا سربراہ خلیفہ کہلاتا ہے۔ اجتماعی زندگی کی تمام بیماریوں کا علاج اسی نظامِ الٰہی میں مض ہے۔ چنانچہ "الھمزیۃ النبویۃ" میں فرماتے ہیں:

دَاءُ الجماعۃِ مِن ارسطالیسَ لَم
یُوصَفُ لَہ حتی أتیتَ دواءُ

(اجتماعی زندگی کی بیماری کی دوا ارسطو کے زمانہ سے بیان نہ کی جا سکی یہاں تک کہ آپؐ د میں تشریف لائے اور اس کے لئے دوا لے آئے۔)

لیکن یہ علاج صرف اک نسخہ کیمیا سے نہیں ہو سکتا بلکہ اس کے لئے ایک ایسے ہی نظامِ حکومت کی بھی ضرورت تھی جو آپ ﷺ نے قائم کیا۔

فرسمتَ بعدَکَ للعبادِ حکومۃً
لاسُوقۃٌ فیھا ولا أمراءُ

(سو آپ ﷺ نے ایک ایسی حکومت کی بنیاد ڈال دی جس میں نہ تو بالکل عام لوگ تھے اور نہ بالکل سرمایہ دار تھے۔) یعنی اس میں تمام طبقوں کی نمائندگی ہوتی تھی۔ اس میں حاکم اور محکوم قسم کے طبقات کی کوئی گنجائش نہ تھی۔

مگر اس نظامِ حکومت میں اللہ وحدہ لاشریک ہی کے احکامات کے مطابق فیصلے کئے جاتے ہیں اور محمود وایاز اس کی بارگاہ میں برابر ہیں۔

اللّٰہُ فَوقَ الخلقِ فیھا وحدَہ
والنّاسُ تحتَ لِوائِھا أکفاءُ

(اس حکومت میں تمام خلقت کے اوپر (حاکمِ مطلق) صرف اللہ تعالیٰ ہے اور تمام لوگ اس حکومت کے جھنڈے تلے برابر ہیں۔)

دین تو آسان ہے اور خلافت خلیفہ اور عوام کے درمیان باہم معاہدہ ہوتا ہے۔ اس میں کوئی امیر ہو یا غریب، کسی کا حق غصب نہیں ہوتا ہے۔ بلکہ تمام معاملات باہمی مشورہ سے طے کئے جاتے ہیں۔ جیسا کہ آپ ﷺ کو بھی حکم الٰہی ہوا کہ:

وَشَاوِرْهُمْ فِی الْأَمْرِ (آل عمران: ۱۵۹)

اے محمد ﷺ دین کے کام میں ان کو بھی شریکِ مشورہ رکھو۔ (یعنی صحابہ کبارؓ کو)

اس عمل کو اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کی بہترین صفات میں شمار کیا ہے:

وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ (الشوریٰ: ۳۸)

(یہ مسلمان) اپنے معاملات آپس کے مشورے سے چلاتے ہیں۔

والـدِّيـنُ يُسْـرٌ وَالـخِلَافَةُ بَيـعَةٌ

وَالْأَمـرُ شُـورىٰ ، والـحقوقُ قَضـاءُ

(دین سیدھا سادہ اور آسان ہے اور خلافت ایک معاہدہ ہے۔ تمام معاملات باہمی مشورہ سے طے پاتے ہیں اور سب کے حقوق یکساں طور پر ادا کئے جاتے ہیں۔)

شوقی جمہوریت کے موئیدین سے کہتے ہیں کہ یہ نظام حکومت انسانی مسائل کا علاج نہیں بلکہ وبال ہے۔

دَاوَيـتَ مُتَّـئِـداً، و دَاوَوا طَفْرَةً

و اَخَفُّ مِـن بـعـضِ الـدواءِ الـداءُ

(آپ ﷺ نے انسانی مسائل اور سماجی بیماریوں کا علاج آہستگی سے کیا جبکہ ان مدعیانِ جمہوریت نے اچھل کود سے ان امراض کا علاج کرنا چاہا۔ حالانکہ بعض علاج ایسے ہوتے ہیں کہ ان کی نسبت خود بیماری آسان اور سہل ہوتی ہے اور علاج مشکل اور تکلیف دہ ہوتا ہے۔)

اسلام میں اگرچہ لڑائی بری چیز ہے لیکن فتنہ وفساد کے قلع قمع کرنے کے لئے جنگ کرنا عین شریعت ہے۔

وَالْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ: (البقرۃ: ۱۹۱)

اسلئے کہ قتل اگرچہ بُرا ہے، مگر فتنہ اس سے بھی زیادہ بُرا ہے۔

وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَفَسَدَتِ الْأَرْضُ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوفَضْلٍ عَلَى

العٰلَمِیۡنَ:(البقرۃ:۲۵۱)
''اگراس طرح اللہ انسانوں کے ایک گروہ کو دوسرے گروہ کے ذریعہ سے ہٹاتا نہ رہتا تو زمین کا نظام بگڑ جاتا لیکن دنیا کے لوگوں پر اللہ کا بڑا فضل ہے۔'' (کہ وہ اس طرح دفعِ فساد کا انتظام کرتا رہتا ہے۔)

الحربُ في حقٍ لَدَيْكَ شريعةٌ
ومن السُّمومِ النَّاقِعاتِ دَواءُ

(آپ ﷺ کے نزدیک حق بات کے لئے جنگ کرنا عینِ شریعت ہے اسلئے کہ بعض اوقات زہرِ قاتل سے بھی علاج کرنا پڑتا ہے۔)
بندگانِ خُدا کے ساتھ نیک سلوک کرنا ایک ضروری فریضہ ہے مگراس کا جتلانا اس کے ضائع کرنے کے مترادف ہے۔
یہ قرآن مجید کی تعلیم ہے اور نظامِ خلافت کا خاصہ ہے:
لَاتُبۡطِلُوۡا صَدَقٰتِکُمۡ بِالۡمَنِّ وَ الۡاَذٰی۔(البقرۃ:۲۶۴)
''اپنے صدقات کو احسان جتا کر اور دُکھ دے کر خاک میں نہ ملاؤ۔''

وَالبِرُّ عندكَ ذِمَّةٌ، و فريضةٌ
لَا مِنَّةٌ مَمْنُونَةٌ و جباءُ

(بھلائی آپ کے نزدیک ذمہ داری اور ضروری فریضہ ہے۔ یہ کوئی احسان نہیں ہے جو کرنے کے بعد جتلایا جائے اور نہ یہ محض ایک عطیہ ہے۔ (جو فرض نہیں ہے)

جَاءَتْ فَوَحَّدَتِ الزَّكَاةُ سَبِيلَهُ
حتّى التقى الكرماءُ وَالبُخَلاءُ

(زکواۃ آئی تو اس نے بھلائی کا راستہ سب کے لئے ایک کر دیا حتیٰ کہ سخی اور بخیل سب مل کر ایک ہو گئے۔)

أنصفتَ أهلَ الفقرِ مِن أهلِ الغنى
فالكل في حقِّ الحياة سواء

فَلَو انَّ اِنسانا تخيّر ملّةً

ما اختار الّا دينكَ الفقراءُ ۲۳

(کوئی انسان خواہ کوئی مذہب اختیار کرے لیکن محتاج اور غریب لوگ تو آپ ﷺ کا دین ہی اختیار کریں گے۔)

مذکورہ بالا اشعار پر قرآنِ کریم ہی کی آیٰت بیّنٰت کا پرتو ہے اور نظامِ خلافت کے لئے ان کی معنوی حیثیت لازم وملزوم کی سی ہے۔ احکامات الٰہی کی بالادستی (Supermacy of God given Laws) سے ہی انسانوں کو انسانوں کی بندگی اور جبہ سائی سے نجات مل جاتی ہے۔ اسلئے شوقی دوٹوک الفاظ میں اعلان کرتے ہیں کہ:۔

فلم أر غیر حکمِ اللّٰہِ حکماً

ولم أردون باب اللّٰہِ بابا ۲۴

(میں اللہ کے حکم کے سوا کسی دوسرے کے حکم کو تسلیم نہیں کرتا ہوں اور میرے نزدیک اللہ کے دروازے کے سوا اور کوئی دروازہ ہے ہی نہیں۔)

شوقی اور عثمانی خلافت

شوقی نے عثمانی خلافت کے حق میں عاطفہ سے بھرپور قصائد لکھے ہیں۔ وہ سمجھتے تھے کہ یہ خلافت وحدت اسلامی کی ایک علامت ہے، دین کے لئے ایک رمز ہے اور اس کے جلال کا علم ہے، اس کے کمزور ہو جانے سے امّت کا شیرازہ بکھر سکتا ہے اور اغیار اس کا بھرپور فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ ۲۵

جب ہم ان عاطفہ سے بھرپور قصائد کا بغائر مطالعہ کرتے ہیں تو ان میں اسلامیت اور خلافت کے لئے محبت اور خلوص کے سوا اور کچھ نظر نہیں آتا۔

جب خدیو عباس حلمی ثانی فریضہ، حج ادا کرنے حجاز گئے تو ان کے لئے قصیدہ لکھا۔ اس کے چند شعر یہ ہیں:

ا۔ إلیٰ عَرفاتِ اللّٰہِ یا ابن مُحمّدٍ

علیك سلام اللّٰہ فی عرفاتِ

۲۔ إذا زُرتَ یا مولای قبرَ محمّدٍ
وقبلت مثوی الأعظم العطراتِ

۳۔ فقل لرسولِ اللّٰہ یا خیر مرسل
أبثاكَ ماتدری من الحسراتِ

۴۔ شعوبُكَ في شرقِ البلاد و غربها
كأصحابِ كهفٍ فی عمیق سُباتِ

۶۔ بأیمانهم نُوران: ذکرٌ وسُنّةٌ
فما بالُهم في حالكِ الظُلُماتِ ۲۶

ا۔ اللہ کے عرفات کی طرف جانے والے زائر اے ابن محمد تم پر عرفات میں اللہ کا سلام ہو

۲۔ میرے آقا جب تم قبر محمد ﷺ کی زیارت کرو گے اور مشکبار روضۂ اقدس کو بوسہ دو گے۔

۳۔ تو اللہ کے رسول ﷺ سے کہنا کہ اے خیرِ مُرسل ﷺ میں آپ ﷺ کی خدمت میں وہی حسرت بھری روداد سنانے آیا ہوں جس سے آپ ﷺ آشنا ہیں۔

۴۔ مشرق ومغرب میں آپ ﷺ کی امت اصحاب کھف کی طرح گہری نیند سو رہی ہے۔ (انہیں شعور ہی نہیں کہ کب اٹھائے جائیں گے۔)

۵۔ ان کے ساتھ دو نور ہیں: 'قرآن وسنت' پھر کس چیز نے انہیں تیرگی میں پہنچا دیا۔

جب ۱۹۲۴ء میں مصطفیٰ کمال پاشا نے خلافت کے خاتمہ اور خلیفہ کی جلا وطنی کا اعلان کیا تو شوقی کو اس سے بڑا دکھ پہنچا اور اس نے ''خلافة الإسلام'' کے عنوان سے ایک نظم لکھی جسے خلافت کا مرثیہ کہنا بجا ہوگا۔

وہ ''خلافت'' کو مخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں:

ا۔ كُفِنتِ في ليلِ الزفافِ بثوبه
و دُفنتِ عند تبلّج الإصباح

۲۔ ضجّت عليكِ مآذنٌ و منابر
وبكت عليك ممالك و نواح

۳۔ الهِنـدُ وَالِهَة و مـصـر حـزيـنة
تبـكـى عـليك بـمـدمـع سـحـاح

۴۔ والشـام تَسـأَلُ و الـعـراق و فـارس
أَمَـحَـا مِـن الأرضِ الـخـلافة مـاحٍ؟

۵۔ يـا لـلـرجـال لـحُـرة مَوءُ وُدَة
قُتلت بِغَيرِ جريرة و جُناح ۲۷

ا۔ تجھے شب زفاف کو زفاف ہی کے لباس کا کفن پہنا دیا گیا اور تو صبح کے طلوع ہونے کے ساتھ ہی دفن کر دی گئی۔

۲۔ اذان کے میناروں اور مسجدوں کے ممبروں نے تیرے لئے آہ وفغاں کی اور ساری مسلمان دنیا نے تیرا ماتم کیا۔

۳۔ ہندوستان غم وحزن کی وجہ سے پاگل ہو رہا ہے اور مصر رنج والم کا شکار ہے۔ یہ سب تیری حالت پر اشکبار ہیں۔

۴۔ اور شام، عراق اور ایران سوال کرتے ہیں۔ کیا کسی مٹانے والے نے زمین سے خلافت کا نام ونشان مٹا دیا؟

۵۔ اس زندہ درگور کی جانے والی آزاد ہستی کے قاتلوں سے اللہ ہی بدلہ لے۔ آہ۔ وہ تو بغیر کسی گناہ اور بغیر کسی جرم کے قتل کر دی گئی۔

اقبال اور تصورِ خلافت

علامہ محمد اقبال کے نزدیک خلافت کا سرچشمہ قرآن کریم ہے۔ اس کی رو سے فرماں روائی کا حق صرف اللہ سبحنہ و تعالیٰ کو حاصل ہے۔ انسان اس دنیا میں خلیفة الله ہے:۔

سروری زیبا فقط اس ذات بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اک وہی باقی بتانِ آزری

اقبال نے اس موضوع پر شوق سے زیادہ وضاحت سے لکھا ہے۔ ''جاوید نامہ'' جو ان کا ایک تخیلاتی اور ملکوتی سفرنامہ ہے۔ عالمِ افلاک کا یہ سفر وہ اپنے مرشد، پیر رومی کی رہبری میں کرتے ہیں۔ فلک عطارد پر وہ سیّد جمال الدین افغانیؒ اور سعید حلیم پاشاؒ کی روحوں سے ملاقات کرتے ہیں اور ان ہی کی زبان سے مسئلہ خلافت پر روشنی ڈالتے ہیں۔ ۲۸

اس بات کا یہاں ذکر کرنا ضروری ہے کہ احمد شوقی نے ''الھمزیة النبویة'' میں خلافت کے متعلق ۱۹۱۷ء میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ ان کے بعد مصر میں ہی مستشرقین سے متاثر ہو کر قاضی عبدالرازق نے ۱۹۲۶ء میں ''الاسلام و أصول الحکم'' لکھ کر مصر کے دینی حلقہ میں سخت بے چینی اور ناراضگی کی لہر پیدا کر دی۔

کتاب میں مصنف مذکور نے یہ دعویٰ کیا کہ ''خلافت'' محض ایک عربی اور رائج الوقت نظام تھا''۔ ۲۹

اس سے قبل سعید حلیم پاشا نے ۱۹۱۷ء میں خلافت کے حق میں ترکی زبان میں ''إسلام الشمق'' لکھی تھی۔ یہ کتاب اتنی مقبول ہوگئی کہ عربی اور فارسی کے علاوہ یورپ کی کئی زبانوں میں اس کا ترجمہ کیا گیا۔ ۳۰

اسی دور میں عبدالحمید الفراہیؒ نے اسی موضوع پر ''فی ملکوت اللہ'' لکھی۔ اس میں امام موصوف نے آیت قرآنی کی روشنی میں اسلامی نظامِ سیاست اور خلافت کی وضاحت کی ہے۔ مگر یہ کتاب مولانا سید سلیمان ندوی اور مولانا امین احسن اصلاحی کے چاہنے کے باوجود ''دائرہ حمیدیہ'' کی مالی مشکلات کی وجہ سے اُس وقت شائع نہ ہو سکی اور ۱۹۷۱ء میں پہلی بار

منظر عام پر آئی۔ کتاب اگرچہ عربی زبان میں لکھی گئی ہے مگر ابھی تک عربی داں حضرات بھی اس سے نابلد ہیں۔ اور یہ امت کی حرماں نصیبی ہے۔ ۳۱

سیّد جمال الدین افغانیؒ وحدتِ اسلامی کے علمبردار تھے۔ اس کے لئے ''خلافت'' کو رکنِ رکین سمجھتے تھے۔ پھر شہید سعید حلیم پاشا اسلامی نظام کے زبردست حامی و مبلّغ تھے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ علامہ محمد اقبال فلکِ عطارد پر ان کی روحوں سے ملاقات کرتے ہوئے ان ہی کی زبان سے مسئلہ ''خلافت'' کی وضاحت کرتے ہیں۔ وہ ان عوامل ونظریات کا پردہ بھی چاک کرتے ہیں جو دین اسلام کی ضد ہیں۔ جیسے مغربی سیاستدانوں کی مکاری وعیاری کہ وہ خود تو مرکز کی تلاش میں ہیں مگر امتِ مسلمہ کو قومیّت، وطنیت اور اقلیمیت (Regionalism) کی تعلیم دے کر ان کے مرکز کو کمزور کر رہے ہیں۔ کیونکہ پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو ان کا طریقہ کار رہا ہے۔ چنانچہ سیّد افغانی کی زبان سے ''دین و وطن'' کے عنوان سے ارشاد فرماتے ہیں:

۱۔ لُردِ مغرب آں سراپا مکر و فن	اہل دیں را داد تعلیم و طن
۲۔ او بفکرِ مرکز و تو در نفاق	بگزر از شام و فلسطین و عراق
۳۔ تو اگر داری تمیز خوب و زشت	دل نہ بندی با کلوخ و سنگ و خشت
۴۔ چیست دین برخاستن از روئے خاک	تاز خود آگاہ گردد جان پاک!
۵۔ می نگنجد آنکہ گفت اللہ ھُو	در حدودِ ایں نظامِ چار سو ۳۲

۱۔ مغرب کا لارڈ جو سراپا مکر وفن ہے۔ اس نے اہل دین کو وطنیت کی تعلیم دی۔ (اس شعر میں اس سازش کی طرف اشارہ ہے جو کرنل لارنس نے حجاز میں رچائی۔ موصوف برطانیہ کے جاسوس تھے جس کو عربوں کو خلافت عثمانیہ کے خلاف بھڑکانے کے لئے بھیجا گیا تھا اور وہ اس مقصد میں کامیاب بھی رہے۔)

۲۔ وہ خود تو (مغربی استعمار) مرکز کی فکر میں ہیں اور تو (مسلمان) نفاق میں پڑا ہوا ہے۔ (یعنی ایک دوسرے کے خلاف وطنیت اور قومیت کی بنیاد پر لڑ رہا ہے)

۳۔ اگر تو اچھے اور برے کی تمیز سے آگاہ ہے تو اینٹوں اور پتھروں سے دل نہ لگا۔ (یعنی وطنیت اور قومیت کی شراب پی کر امتِ مسلمہ کو ٹکڑے ٹکڑے نہ کر)

۴۔ دین کیا ہے خاک پر سے اٹھنے کا نام ہے تا کہ جانِ پاک اپنے آپ سے آگاہ ہو جائے۔

۵۔ جس نے ''اللہ ھُو'' کہا وہ جہانِ چارسو میں نہیں سما تا ہے۔ مراد یہ ہے کہ موحّد وطنیت کے حدود وقیود میں نہیں سما تا ہے۔ بلکہ سارا عالم اس کا وطن ہے۔

علامہ محمد اقبال نے اپنے اردو کلام میں بھی اس موضوع پر تفصیل سے لکھا ہے۔ مثلاً ''بانگِ درا'' میں ''وطنیت'' کے عنوان سے جو نظم لکھی ہے اس میں فرماتے ہیں:۔

اس دور میں مے اور ہے جام اور ہے جم اور
ساقی نے بنا کی روش لطف و ستم اور
مسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور
تہذیب کے آذر نے ترشوائے صنم اور
ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے
یہ بت کہ تراشیدۂ تہذیب نوی ہے
غارت گر کاشانۂ دینِ نبوی ہے
بازو ترا توحید کی قوت سے قوی ہے
اسلام ترا دیس ہے تو مصطفوی ہے
نظارۂ دیرینہ زمانے کو دکھا دے
اے مصطفوی خاک میں اس بت کو ملا دے ۳۳؎

اشتراکیت:۔

سیّد افغانیؒ ہی کی زبان سے اشتراکیت پر بڑی منصفانہ تنقید کی ہے۔ فرماتے ہیں کہ کارل مارکس کے اس نظام باطل میں کسی قدر حق کی آمیزش ہے۔ مگر اس حق ناشناس فلسفی نے اپنے فلسفہ کی بنیاد مساواتِ شکم پر رکھی ہے جبکہ مساوات اخوّت پر مبنی ہے اور اخوّت کا مقام دل ہے نہ کہ شکم:

۱۔ صاحب سرمایہ از نسلِ خلیل
یعنی آں پیغمبر بے جبرئیل
۲۔ زانکہ حق در باطلِ او مضمر است.
قلبِ او مؤمن دماغش کافر است
۳۔ مؤمنِ آں پیغمبرِ حق ناشناس
بر مساواتِ شکم دارد اساس
۴۔ تا اخوت را مقام اندر دل است
بیخِ او در دل نہ در آب و گلِ است ۳۴؎

۱۔ حضرت خلیلؑ کی نسل کا وہ صاحب ''سرمایہ'' (کارل مارکس کی کتاب کا نام) یعنی وہ پیغمبر بے جبرئیل۔ (اسلئے کہ ''سرمایہ'' اس کی فلسفیانہ اپج ہے)

۲۔ اس کی تعلیم اگر چہ باطل ہے مگر اس میں حق کا عنصر بھی شامل ہے۔ اسلئے کہ اس کا دماغ کافر

ہے (وہ خدا کا منکر ہے) مگر اس کا دل مومن ہے۔ (وہ انسانیت کے جذبے سے سرشار ہے)
۳۔ اس منکرِ خدا فلسفی کا مذہب مساواتِ شکم پر مبنی ہے۔
۴۔ جبکہ مساوات اخوّت پر منحصر ہے اور اخوت کا مقام دل ہے نہ کہ شکم۔

کارل مارکس جس مساوات کی بات کرتا ہے۔ اس کا تعلق پیٹ سے ہے۔ یہ مساوات فطرت کے منشا کے خلاف ہے۔ اسلام جس مساوات کی بات کرتا ہے۔ اس کا تعلق دل سے ہے جو عین منشائے فطرت ہے۔ ۳۴

ملوکیت:۔ اشتراکیت کی طرح ملوکیت کا سینہ بھی دل سے (عقیدۂ توحید سے) خالی ہوتا ہے۔ جس طرح شہد کی مکھی پھولوں کا رس چوس لیتی ہے اور برگہائے گل چھوڑ دیتی ہے، اسی طرح بادشاہ بھی رعایا کو جوہرِ انسانیت (حریت) سے محروم کر دیتے ہیں:۔

۱۔ ہم ملوکیت بدن را فربہی است　　سینۂ بے نورِ او از دل تہی است
۲۔ مثل زنبورے کہ بر گل می چرد　　برگ را بگذارد و شہدش برد ۳۵

۱۔ ملوکیت (بادشاہت) بدن کو موٹا تو کرتی ہے مگر اس کا بے نور سینہ دل سے (عقیدۂ توحید سے) خالی ہوتا ہے۔
۲۔ جس طرح شہد کی مکھی پھول پر چرتی ہے (پھول کا رس چوس لیتی ہے) پھر اس کے پتوں کو (اپنے حال پر) چھوڑ دیتی ہے اور اس کا رس لے جاتی ہے۔

پھر سعید حلیم پاشا کی زبان سے مصطفیٰ کمال کی تجدّد پسندی کو غیر اسلامی اور ملّت کش قرار دیتے ہوئے ترکوں کو قرآن کریم کے مطالعہ کرنے اور اس کو مضبوطی سے تھامنے کی تلقین کرتے ہیں:

۱۔ مصطفیٰ کو از تجدّد می سرود　　گفت نقشِ کہنہ را باید زدود
۲۔ بندۂ مومن ز آیاتِ خدا ست　　ہر جہاں اندر برِ او چوں قباست
۳۔ چوں کہن گردد جہانے در برش
می دہد قرآں جہانے دیگرش ۳۶

۱۔ مصطفیٰ کمال پاشا نے تجدّد کا راگ الاپا اور ترکوں سے کہا کہ پرانے نقوش کو مٹا دینا چاہئے۔

(یعنی اسلامی قدروں اور روایات کو مٹا دینا چاہیئے)

۲۔ (حالانکہ بندۂ مومن تو خدا کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے۔ اس کے پہلو کا ہر جہان اس کے لئے قبا ہے۔ (یعنی وہ ہر زمانہ میں زندہ رہنے اور ترقی کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے کیونکہ قرآن کی تعلیمات کی خصوصیت یہی ہے کہ وہ ہر زمانے میں داروئے حیات ہیں۔

۳۔ جب یہ جہاں اس کے لئے (مردمومن کے لئے) پرانا ہو جائے گا تو قرآن کی بدولت نیا جہان پیدا کر سکے گا۔

جمہوریت:۔ اقبال یورپ کے جمہوری نظام کو نااہل اور قابل صد افسوس قرار دیتے ہیں اسے ایسے شعبدہ بازوں کی جماعت قرار دیتے ہیں جو کمزور قوموں کو اپنا غلام بناتی رہتی ہے اس نظام نے انسانوں کے اخلاق تباہ کیئے، عورتوں کے حقوق پامال کیئے، اسے شمع محفل بنا دیا اس حد تک کہ وہ ولادتِ اطفال سے نفرت کرتی ہیں۔ اس نظام کے مفاسدِ کثیرہ بیان کرنے کے بعد مسلمانوں کو نصیحت کرتے ہیں کہ قرآنِ حکیم ہی کو اپنا آئین اور دستورِ حیات بنالیں:

اے بتقلیدش اسیر آزاد شو   دامنِ قرآن بگیر آزاد شو۳۷

(اے مسلمان (یورپ کے اس جمہوری نظام) کی تقلید سے آزاد ہو جا۔ قرآن کا دامن مضبوطی سے تھام لے اور آزاد ہو جا۔)

ان جمیع خود ساختہ نظامہائے حیات پر مناسب تنقید کرنے کے بعد وہ سیّد افغانی کی زبان سے اسلامی نظام حیات وخلافت پر روشنی ڈالتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اس میں رنگ وخون، نسل وطن اور ذات پات کا کوئی امتیاز نہیں ہے۔ اس نظام میں نہ کوئی بادشاہ ہے اور نہ کوئی انسان کسی انسان کا غلام:

۱۔ عالمے بے امتیازِ خون و رنگ   شامِ اور روشن تراز صبح فرنگ

۲۔ عالمے پاک از سلاطین و عبید   چوں دل مومن کرانش ناپدید۳۸

ترجمہ:۱۔ وہ رنگ وخون کی تمیز نہ رکھنے والا جہان ہے۔ اس جہان کی شام فرنگیوں کی صبح سے زیادہ روشن ہے۔

۲۔ وہ ایک ایسا جہان ہے جو آقاؤں اور غلاموں کی تمیز سے پاک ہے۔ مؤمن کے دل کی

طرح اس کا کوئی کنارہ نظر نہیں آتا ہے۔
یہ بات محکماتِ قرآنی سے واضح ہے کہ آدم اس دنیا میں اللہ کا خلیفہ ہے:

حرفِ ''اِنّی جاعل'' تقدیرِ او
از زمین تا آسماں تفسیرِ او ۳۹

ترجمہ: (اس کی تقدیر ''اِنّی جاعل'' ہے۔ یعنی اس کی تخلیق کی غایت یہ ہے کہ وہ اِنّی جاعِلٌ فی الارضِ خلیفۃ: البقرۃ ۳۰ (میں دنیا میں اپنا ایک نائب بنانے والا ہوں) کے مصداق ہے۔ اور ساری کائنات اس کی تفسیر ہے۔
اس حکومتِ الٰہی میں قومیّت، وطنیت اور اقلیمیت کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ بندۂ مومن ہر مقام سے آزاد ہوتا ہے۔ وہ کسی کا غلام نہیں ہوتا ہے۔ وہ صرف اللہ کے آئین کا پابند ہوتا ہے:

بندۂ حق بے نیاز از ہر مقام　　نے غلام اورا نہ اوکس را غلام
بندۂ حق مرد آزاد است و بس　　ملک و آئینش خدا داد است و بس ۴۰

ا۔ بندۂ حق ہر مقام سے بے نیاز ہے۔ نہ اس کا کوئی غلام ہے اور نہ وہ کسی کا غلام ہے۔
۲۔ بندۂ حق آزاد مرد ہے۔ اس کا ملک اور آئین خدا کا دیا ہوا ہے۔
زمین دراصل خدا ہی کی مِلکیت ہے:

باطنِ الْاَرضُ لِلّٰہِ ظاہر است　　ہر کہ ایں ظاہر نہ بیند کافر است ۴۱

(یہ زمین حقیقت میں اللہ کی مِلکیت ہے۔ اس لحاظ سے کسی انسان کو اس پر قابض ہونے کا حق حاصل نہیں ہے اور جو شخص اس واضح اور صاف حقیقت کو نہیں دیکھتا ہے یعنی اس واضح تعلیم کو قبول نہیں کرتا ہے وہ مسلمان نہیں بلکہ کافر ہے۔)
یوں اقبال نے محکماتِ عالمِ قرآنی کی روشنی میں ''خلافتِ آدم''، ''حکومت الٰہی'' اور ''ارض ملکِ خُدا است'' پر اپنے مخصوص حکیمانہ اور عارفانہ اشعار میں مفصل روشنی ڈالی ہے۔ راقم نے بہت ہی اختصار کے ساتھ اس کا زُبدہ بیان کرنے کی ایک سعی کی ہے۔ مگر صرف اتنی سی بات نہیں ہے۔ شوقی اور اقبال دونوں اسلام اور عالمِ اسلام کی بقا کے خاطر عثمانی خلافت سے قلبی لگاو رکھتے تھے، عرب قومیت کو ناپسند کرتے تھے اور یورپی استعمار کے کٹھ پتلی عرب حکمرانوں پر حق بجانب تنقید بھی کی ہے۔

اقبال کے فرزندار جمند ڈاکٹر جاوید اقبال اپنی مشہور کتاب ''زندہ رود'' میں رقمطراز ہیں:

''انجمن (حمایت اسلام) کے سالانہ اجلاس منعقدہ ۱۶/اپریل ۱۹۲۲ء میں انہوں نے اپنی مشہور نظم ''خضرِ راہ'' کوئی بیس ہزار کے مجمع کے سامنے پڑھی۔ اقبال کو ان دنوں نہ صرف تنہائی کا شدید احساس تھا بلکہ بیمار بھی تھے۔ اسلئے نظم کے اندازِ بیان نے سامعین کو رُلا دیا۔ نظم پڑھتے ہوئے اقبال نے یہ شعر پڑھا تو رو پڑے:

بیچتا ہے ہاشمی ناموسِ دینِ مصطفیٰ
خاک و خوں میں مل رہا ہے ترکمانِ سخت کوش

اور جب اس شعر پر پہنچے تو خود بھی رو رہے تھے اور سارا مجمع بھی اشکبار تھا:

ہو گیا مانندِ آب ارزاں مسلماں کا لہو
مضطرب ہے تو کہ تیرا دل نہیں دانائے راز ۴۲

یہاں ناموس دینِ مصطفیٰ کے سوداگر ''ہاشمی'' سے مراد شریفِ مکہ (شریف حسین ہاشمی) کے سوا اور کون ہوسکتا ہے پھر ترکمان سخت کوش سے مراد عثمانی خلافت ہی ہو سکتی ہے۔ (اس موضوع پر پہلے ہی مفصل بحث ہو چکی ہے)

سیّد ابو الحسن علی ندویؒ ''نقوش اقبال''، ص ۴۰۔ میں رقمطراز ہیں کہ:

''اس زمانہ میں ان کے (اقبال کے) سینے کا جوش، دل کا فیضان اور طبیعت کا سیلان اپنے عروج پر تھا، اس وقت انہوں نے جو نظمیں کہیں ان میں ''خضرِ راہ'' گلِ سر سبد کا حکم رکھتی ہے، جس کا ہر قطعہ شعر و ادب، دروں بینی اور حقیقت شناسی کا شاہکار ہے، لیکن ''طلوع اسلام'' بیت الغزل کا حکم رکھتا ہے، جس کی مثال اسلامی ادب میں مشکل سے کہیں اور مل سکے گی''

اسی ''طلوع اسلام'' کے دوسرے بند کا چوتھا شعر عثمانیوں کے متعلق ہے:

اگر عثمانیوں پر کوہِ غم ٹوٹا تو کیا غم ہے
کہ خونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا ۴۳

''ضرب کلیم'' میں عرب قومیت پر ضرب کاری لگاتے ہوئے فرماتے ہیں:

کرے یہ کافرِ ہندی بھی جراتِ گفتار
اگر نہ ہو امرائے عرب کی بے ادبی
یہ نکتہ پہلے سکھایا گیا کس امت کو!
وصالِ مُصطفوی، افتراقِ بو لہبی
نہیں وجود حدود وثغور سے اس کا
محمدؐ عربی سے ہے عالمِ عربی [44]

امت مسلمہ کے مرکز اور دل وجگر، الجزیرۃ العربیۃ میں ۱۹۲۴ء میں سعودی بادشاہت کے مؤسّس اور اس کا نیا نام ''المملکۃ العربیّۃ السعودیۃ'' رکھنے والے الملک عبدالعزیز ابن سعود (۱۸۸۰-۱۹۵۳م) سے مخاطب ہو کر علامہ محمد اقبالؔ نے ''ارمغانِ حجاز'' میں کئی نصیحت آموز، دل کی گہرائیوں میں اترنے والی اور آنکھوں کو اشکبار کرنے والی رباعیاں لکھی ہیں۔ان میں سے چند یہ ہیں:

تو سلطانِ حجازی من فقیرم ولے در کشورِ معنی امیرم
جہانے کوز تخمِ لا الٰہ رست بیا بنگر بآغوشِ ضمیرم

۱۔ (اے ابن سعود) تو حجاز کا (جہاں مکہ ومدینہ ہے) سلطان ہے اور میں تو ایک فقیر ہوں لیکن میں معنی کی ولایت (بادشاہت) کا امیر ہوں۔
۲۔ وہ جہان جو کلمہ طیبہ (لا إله إلا الله محمّد الرسول الله ﷺ) کے بیج سے اگا ہے اسے میرے ضمیر کے پہلو میں دیکھ۔

ترا اندر بیا بانے مقام است کہ شامش چوں سحر آئینہ فام است
بہر جائے کہ خواہی خیمہ گستر طناب از دیگراں جستن حرام است

۱۔ (اے ابن سعود) تیرا قیام عرب کے صحرا میں ہے۔وہ صحرا بھی ایسا کہ جس کی شام صبح کے آئینہ کی مانند روشن ہے۔
۲۔ (چونکہ سرزمینِ عرب تیرے زیرِ نگین ہے) اسلئے تو جہاں چاہے اپنا خیمہ لگا۔لیکن اس کو کھڑا کرنے کے لئے جو رسیاں درکار ہیں وہ دوسروں سے مت لے۔

۱۔ ز افرنگی صنم بیگانہ تر شو کہ پیمانش نمی ار زد بہ یک جو

۲۔ نگاہے دام کن از چشمِ فاروقؓ قدم بیباک نہ در عالمِ نو۴۵؎

ا۔ (اے ابن سعود) انگریزی بت (معشوق) سے دور رہ کیونکہ اس کی شراب کا پیالہ ایک جَو کے برابر قیمت نہیں رکھتا ہے۔

۲۔ اگر تجھے حرمین شریفین کے خادم ہونے کا دعویٰ ہے تو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے نگاہ ادھار لے پھر نئے جہان میں بے خوف ہو کر قدم رکھ۔

یعنی ملوکیت کے بجائے خلافت اختیار کر کہ ایسی صورت میں تجھے افرنگیوں کی طرف دیکھنے کی ضرورت نہیں رہے گی۔

اپنی معروف و مشہور مثنوی ''پس چہ باید کرد اے اقوامِ مشرق'' میں علامہ مرحوم نے ''حرفے چند با امت عربیہ'' کے عنوان سے عالمِ عرب سے چند انمول باتیں ۳۹/اشعار میں ارشاد فرمائی ہیں۔ ان میں انہیں اپنا شاندار ماضی یاد دلایا ہے۔ جب وہ نبی اکرم ﷺ کی اتباع میں امیین ہونے کے باوصف معلمینِ عالم بن گئے۔ حریت پروردہ بن گئے۔ اقوامِ عالم کو انسانوں کی غلامی سے نجات دلانے والے اور خدائے واحد کی عبدیت کی طرف لانے والے بن گئے۔ آخر یہ سب اقامتِ دین یا اقامتِ خلافت ہی سے تو ہُوا۔ اس میں سے چند اشعار یہ ہیں:

ا۔ از دمِ سیراب آں امی لقب لالہ رست از ریگِ صحرائے عرب

۲۔ حریت پروردۂ آغوشِ اوست یعنی امروز امم از دوش اوست ۴۶؎

ا۔ اس امی لقب صلی اللہ علیہ وسلم کے دم سے صحرائے عرب کی ریت سے لالے اگے۔ (یعنی خلفائے راشدین و دیگر صحابہ کبارؓ، علماء، فضلاء اور حکماء وغیرہ)

۲۔ حریت ان کی آغوش کی پروردہ ہے یعنی اقوام عالم پر آج آپ کا ہی فیضانِ رحمت ہے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت شعاری مین تمام عرب ایک وحدت تھے، ایک امت تھے۔ لیکن جب وہ مختلف قومیتوں میں بٹ گئے تو کمزور ہو کر بکھر گئے ان کی ہوا ہی اکھڑ گئی اور وہ بے موت مر گئے:

ا۔ آنچہ تو با خویش کردی، کس نہ کرد روحِ پاک مصطفیٰؐ آمد بدرد

۲۔اے تو افسونِ فرنگی بے خبر　　فتنہ ہا در آستینِ او نگر

۳۔از فریب او اگر خواہی اماں　　اشترانش را ز حوض خود براں[۱۷]

۱۔جو کچھ تم نے خود سے کیا کسی اور نے نہیں کیا۔تمہاری ان بداعمالیوں کو دیکھ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی روح کو تکلیف پہنچتی ہے۔

۲۔اے انگریزوں کی فریب کاری سے بے خبر امتِ عربیہ اس کی آستین میں پوشیدہ فتنوں کو دیکھ (کہ وہ تمہیں آپس میں لڑارہے ہیں۔تم پراپنی گرفت مضبوط کررہے ہیں۔)

۳۔اگر تم اس کی فریب کاریوں سے نجات چاہتے ہو تو اس کے اونٹوں کو اپنے حوض (تالاب) سے ہانک دے۔

☆☆☆☆

حوالہ جات

سورۃ الزخرف:۸۴۔
نعمانی، علامہ شبلی، وندوی، سیّد سلیمان، سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلّم، جلد ہفتم، لاہور، الفیصل
ناشران، اردو بازار، ۱۹۹۱ء، ص ۱۸-۳۹
۲۔سورۃ یوسف:۴۰۔
ڈاکٹر عبیداللہ فہد فلاحی، احیائے دین اور ہندوستانی مسلمان، بارہمولہ، کشمیر، القلم پبلی کیشنز
۲۰۱۱ء، ص ۲۹۔
۳۔سورۃ ھود:۱۰۷۔
۴۔اصلاحی، مولانا صدرالدین، تلخیص تفہیم القرآن از ابوالاعلیٰ مودودی، دہلی، مرکزی
مکتبہ اسلامی، ۱۹۸۶ء ص ۸۴۰۔سورۃ الحدید، حاشیہ ۲۔
۵۔سورۃ آل عمران:۱۹
۶۔سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلّم، جلد ہفتم، ص ۴۳۔
۷۔سورۃ البقرۃ ۳۰، سورۃ النور:۵۵
۸۔سورالنساء:۶۵
سورۃ الاحزاب:۳۶
مودودی، سیّد ابوالاعلیٰ تفہیم القرآن، جلد اوّل، دہلی، مرکزی مکتبہ اسلامی، ۱۹۴۹ء، ص ۶۲
احیائے دین اور ہندوستانی مسلمان، ص ۵۷۔
۹۔سیرۃ النبی، جلد ہفتم، ص ۴۳
۱۰۔سورۃ الانعام:۱۲۲
۱۱۔سورۃ المائدۃ:۸
۱۲۔سورۃ القصص:۸۳
۱۳۔الندوی، ابوالحسن علی الحسنیؒ، ما ذا خسر العالم بانحطاط المسلمین، لکنا(
(الھند)، المجمع الاسلامی العلمی، ندوۃ العلماء، ۱۹۹۴ء ص ۱۱۷-۱۲۰۔

۱۔ سیرۃ النبیؐ صلی اللہ علیہ وسلم ہفتم، ص۱۹۰

۔ Arnold, T. W. The Preaching of Islam, Second Edition, Delhi, 1990. He says, "But Islam was to rise again from the ashes of i former grandeur and through its preachers win over these sava conquerors to the acceptance of the faith." p. 21

یائے دین اور ہندوستانی مسلمان، ص۱۴۲۔

۔ ایضاً، ص۱۴۲۔

۔ ایضاً، ص۱۴۳۔

تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیں: ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین، ص۱۴۱-۱۴۹۔

۔ ماذا الاخسر العالم بانحطاط المسلمین، ص۱۴۳۔

۔ ایضاً، ۱۴۳-۱۴۷

۔ نعمانی، علامہ شبلی، سفرنامہ روم، مصر وشام، اعظم گڑھ، دار المصنفین ۱۳۱۹ھ ص۴۔

۔ ماذا اخسر العالم بانحطاط المسلمین، ص۱۴۹۔

لالتزام فی اشعر العربی، ص۱۶۴-۱۷۱

زید تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیں

(i) With Lawrence in Araleia. and

(ii)Liteutenant - General Sir John Bagot Glubb, war in The Desert London, Hodder and Stoughton

۲۲۔ مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش، ص۱۴۸-۱۴۹۔

۲۳۔ الشوقیات، الجزء الاوّل ص۳۱۔

۲۴۔ ایضاً، ص۵۶

۲۵۔ الإسلام فی شعر شوقی، ص۱۰۱-۱۱۱۔

۲۶۔ الشوقیات، الجزء الأوّل، ص۷۹، ۸۲۔

دکتور ماهر حسن فهمي، شوقی شعره الإسلامي، القاهرة، دار المعارف بمصر ۱۹۵۳ء ص ۵۷-۵۸

۲۷۔ الشوقیات، الجزء الأوّل، ص ۸۵-۸۶

شوقی شعره الإسلامی، ص ۶۳-۶۴۔

۲۸۔ اقبال، جاوید نامہ، لاہور، شیخ غلام علی اینڈ سنز، کشمیری بازار، طبع سوم، ۱۹۵۴ء، ص ۶۳-۷۶۔

مزید تفصیل کے لیے:

ڈاکٹر عبدالشکور احسن، اقبال کی فارسی شاعری کا تنقیدی جائزہ، لاہور، اقبال اکادمی پاکستان طبع دوم، ۲۰۰۰ء، ص ۱۳۹-۱۵۰

۲۹۔ أنور الجندی، المعارك الأدبية فی مصر منذ ۱۹۱۴ء/۱۹۳۹ء، القاهرة، مكتبة الأنجلو المصرية، ۱۹۸۲ء، ص ۳۳۴-۳۴۵۔

مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش، ص ۱۴۸-۱۴۹۔

۳۰۔ شرح جاوید نامہ، پروفیسر یوسف سلیم چشتی، جلد اوّل، ص ۴۹۳-۴۹۴۔

۳۱۔ المعلّم عبدالحمید الفراهی، فی ملکوت الله، سرایمیر، اعظم کرة ۱۳۹۱ھ/(۱۹۷۱ء)۔

ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی، ذکر فراہی، سرائے میر، اعظم گڑھ، دائرہ حمیدیہ، ۲۰۰۱ء، ص ۵۹۹-۶۰۰۔

عبدالرحمٰن ناصر اصلاحی (مرتب)، "مختصر حیاتِ حمید"، سرائیمر، اعظم گڑھ، دائرہ حمیدیہ ۱۹۷۳ء، ص ۶۱

۳۲۔ جاوید نامہ، ص ۶۷۔

۳۳۔ کلیاتِ اقبال (اردو)، ص ۱۳۲-۱۳۳۔

۳۴۔ جاوید نامہ، ص ۶۹۔

۳۵۔ ایضاً، ص ۷۰

٣٦۔ ایضاً، ص ٧٢

٣٧۔ ایضاً، ص ٨٠

٣٨۔ ایضاً، ص ٧٣

٣٩۔ ایضاً، ص ٧٤

٤٠۔ ایضاً، ٧٨

٤١۔ ایضاً، ص ٨١

مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیں

جاوید نامہ، ص ٦٣-٨١۔

٤٢۔ ڈاکٹر جاوید اقبال، زندہ رود، لاہور، اقبال اکادمی پاکستان، ٢٠٠٤ء، ص ٣١٧ بحوالہ اقبال اور انجمن حمایت اسلام، از محمد حنیف شاہد، ص ٨٧-٨٨۔

٤٣۔ کلیات اقبال (اردو)، ص ٢١٩) بانگ درا، ص ٢٠٧۔

٤٤۔ کلیات اقبال (اردو)، ص ٤٤٢۔ ضرب کلیم، ص ٥٦

٤٥۔ کلیاتِ اقبال (فارسی)، ص ٧٦٠-٧٦٢

٤٦۔ ایضاً، ص ١١٩٦۔

٤٧۔ ایضاً، ص ١١٩٩۔

☆☆☆☆

﴾باب ہشتم﴿

شوقی اور اقبال کی اُندُلسیات

گلستانِ اَندلُس (اسپین)

جزیرہ نما اَندلُس براعظم یورپ کے جنوب مغرب مس واقع ہے۔ مشرق میں بحر ابیض (Mediteranean Sea) اور مغرب وشمال مغرب میں بحر اوقیانوس (Atlantic Ocean) اس کو گیرے ہوئے ہے۔ شمال مشرق میں فرانس کے پہاڑ اس کے لئے سرحد کی حیثیت رکھتے ہیں۔ آبنائے جبل طارق اس کو شمالی افریقہ سے جدا کرتی ہے۔ شمالی افریقہ اور جنوبی اندلس کے درمیان اس آبنائے کا فاصلہ قریب ترین جگہوں پر تقریباً پندرہ کلومیٹر کا ہے۔ اَندلس کئی پہاڑی سلسلوں، گھنے درختوں، حسین جھیلوں، شیریں چشموں، شاداب چراگاہوں، سبزہ زاروں، مشہور دریاؤں اور نہروں کی سرزمین ہے۔ لیکن اس کے باوجود یہاں کے بعض مقامات بارش برسانے والے بادلوں کے محتاج بھی ہیں۔ [1]

سرزمین اندلس آج دو مملکتوں پر مشتمل ہے، اسپین اور پرتگال۔ پرانے زمانے میں اسے ایبریا (Ibria) کے نام سے جانا جاتا تھا جو ایبرین سے نسبت رکھتا ہے۔ یہی لوگ یہاں کے قدیم ترین باشندے تھے۔ پھر رومیوں کے عہدِ حکومت میں اس جزیرہ نما کا نام ھسپانیہ (Hespania) رکھا گیا۔ ھسپانیہ کے جنوبی حصہ کا نام بتیکا (Betica) تھا۔ لیکن جب یہاں ونڈال (Vandalos) سکونت پزیر ہو گئے تو اس کا نام ونڈالیسیا (Vandalisia) پڑ گیا۔

پھر جب مسلمانوں نے اسے فتح کیا تو انہوں نے پورے جزیرہ نما کا نام اندلس رکھا۔ ارجح رائے یہ ہے کہ اس نام کو مسلمانوں نے "وندلس" (Vandalos) سے اَخذ کیا ہے۔ پھر مسلمان مؤرخین، جغرافیہ دان اور علماء و ادباء نے اس سرزمین کو اندلس ہی کے نام سے یاد کیا ہے۔ [2]

مسلمان اَندلس میں

اے گلستانِ اندلس وہ دن ہیں یاد تجھ کو
تھا تیری ڈالیوں میں جب آشیاں ہمارا ۳ے

عہدِ اموی میں الولید بن عبدالملک (۷۰۵م-۷۱۵م) کے زمانۂ خلافت تک مسلمانوں نے تمام شمالی افریقہ کو فتح کر لیا تھا۔ یہاں خلیفہ کے لائق و فائق والی موسیٰ بن نُصیر نے اسلام کو فروغ دینے، مملکت کو استحکام بخشنے اور اسے بحرِ اوقیانوس (المحيط الأطلسي) کے کناروں تک وسعت دینے میں ناقابل فراموش کارنامے انجام دئے ہیں۔

اسی زمانے میں بادشاہ روڈرک (King Rodric) اندلس کا حکمران تھا۔ بادشاہ بڑا عیاش تھا۔ اس کے محل میں تمام امراء کی بیٹیاں ہوتی تھیں۔ ان ہی میں سے فلورِڈا (Florida) نامی ایک بیٹی کاونٹ جولین (Count Julian) کی تھی جو سبتہ کا حاکم تھا۔ روڈرِک کو فلورِڈا بھلی لگی اور وہ اس کے ساتھ زیادتی کر بیٹھا۔ بیٹی نے اپنے باپ جولین سے اس کی شکایت کی۔ اس بنا پر کاونٹ جولین نے شمالی افریقہ کے والی موسیٰ بن نصیر سے خواستگاری کی کہ وہ آکر اندلس کو فتح کریں۔ اس کارِ خیر کے لئے ان سے اپنی طرف سے ہر ممکن مدد کی پیش کش بھی کی۔

اندلس کے یہودی بھی مسلمانوں کی طرف آس لگائے بیٹھے تھے۔ کہ وہ ان کی درماندگی کا مداوا کریں گے۔ کیونکہ ان کی عزّت و آبرو داؤ پر لگی ہوئی تھی، ان کا دین و ایمان رومی عیسائیوں کی دست بُرد سے محفوظ نہ تھا، وہ انہیں جبراً عیسائی بنا رہے تھے اور ان کی جان و مال اور ناموس پر ہر آن منحوس گھٹائیں منڈلاتی رہتی تھیں۔ اس کے علاوہ معاملات جو بھی رہے ہوں ان کو سامنے رکھتے ہوئے موسیٰ بن نصیر نے خلیفہ الولید بن عبدالملک سے اندلس کو فتح کرنے کی اجازت حاصل کی۔

چنانچہ موسیٰ بن نصیر نے ۹۱ھ بمطابق ۷۱۰ء کو ضروری معلومات حاصل کرنے کے لئے اندلس ایک سَرِیہ (فوجی دستہ) بھیجا۔ سریہ کے واپس آنے کے بعد پھر ماہ شوال ۹۲ھ بمطابق اپریل ۷۱۱ء کو اس نے طارق بن زیاد کی قیادت میں ۱۲۰۰۰ مجاہدین کو شمالی افریقہ کی آبنائے سے بحری جہازوں میں روانہ کیا۔ اس کے بعد سے اس آبنائے کا نام بھی "مُضِیقُ جبل طارق" (طارق کے پہاڑ کی آبنائے) پڑ گیا۔ جنوبی اندلس میں جہاں طارق پہلے اپنے لشکر کے ساتھ فروکش ہوئے وہ جگہ بھی "جبل طارق" (Gibraltar) کے نام سے موسوم ہو گئی۔ ۴

جب راڈرک (Roderick) کو اندلس میں طارق بن زیاد اور اس کے لشکر کے ورود کی خبر پہنچی تو وہ تیزی سے اپنے دارالخلافہ طلیطلة چلا آیا۔ وہاں اس نے وقت ضائع کیے بغیر ایک لاکھ سپاہیوں پر مشتمل لشکرِ جرار تیار کیا اور طارق سے لڑنے کے لئے جنوب کی طرف روانہ ہوا۔

یہ بات مشہور ہے کہ طارق نے اندلس پہنچ کر اپنے سفینوں کو جلا ڈالنے کا حکم دیا۔ پھر اپنے لشکر کے سامنے ایسا خطبہ دیا جو یادگار زمانہ ہے۔ اسے مؤرخین نے اپنی کتابوں میں رقم کیا، ادبا نے اپنے ادبی شہ پاروں میں بیان کیا، خطیبوں نے اسے زبانی یاد کر لیا اور اُس وقت طارق کے لشکر نے اسے حرزِ جاں بنا لیا:

"أيها الناس، أين المفر؟ اَلبَحرُ وَرَاءَ كُم وَالعَدُوُّ أمَامَكُم، وَلَيسَ لَكُم إلاَّ الصِّدقَ وَالصَّبر، وَاعلَمُوا أنَّكُم فِي هذِهِ الجَزِيرَة۔ أضيَعُ مِنَ الأَيتَامِ على مَائدَةِ اللِّئَام، وَقَد استَقبَلَتكُم عَدُوُّكُم بِجَيشِهِ وَ أسلِحَتِهِ وَ أقوَاتِهِ مَوفُورَة وَ أنتُم لاَ وَزَرَ لَكُم إلاَّ سيوفكم و لا أقوات لكم إلا ماتَستَخلِصُونَ من أيدي عَدُوِّكُم۔ ۵

(اے لوگو جائے فرار کہاں ہے؟ سمندر تمہارے پیچھے ہے اور دشمن تمہارے سامنے ہے، واللہ تمہارے لئے سچائی اور صبر کے سوا اور کوئی چارۂ کار نہیں ہے، اور جان لو کہ تم اس جزیرہ میں کنجوسوں کے دستر خوان پر یتیموں سے بھی گئے گزرے ہو۔ تمہارا دشمن وافر مقدار میں اپنے لاؤ لشکر، اپنے ساز و سامان اور اپنے خورد نوش کے ساتھ تمہارے سامنے ہے جبکہ تمہارے پاس تمہاری تلواروں کے سوا کوئی جائے پناہ نہیں ہے، اور نہ تمہارے پاس کوئی سامان

خوردونوش ہے ماسوائے اس کے جوتم اپنے دشمنوں کے ہاتھوں سے چھین لوگے......

اقبال نے ''پیام مشرق'' میں اس واقعہ کو اپنے انوکھے انداز میں بیان کیا ہے:

ا۔ طارق چو بر کنارۂ اندلس سفینہ سوخت — گفتند کارِ تو بہ نگاہِ خرد خطاست

۲۔ دوریم از سوادِ وطن باز چوں رسیم؟ — ترکِ سبب ز روئے شریعت کجا رواست

۳۔ خندید و دستِ خویش بہ شمشیر بردو گفت — ہر ملک ملکِ ماست کہ ملکِ خدائے ماست ۶

ترجمہ:۔

ا۔ طارق بن زیاد نے اندلس کے ساحل پر اپنی فوجیں اتارنے کے بعد اپنے بحری بیڑے کو آگ لگادی تو اس کے فوجیوں نے اس سے کہا کہ از روئے عقل تمہارا فعل غلط ہے۔

۲۔ ہم وطن کی سرحد سے دور ہیں، واپس کیسے جائیں گے۔ اسباب کا ترک کرنا از روئے شریعت کب درست ہے؟

۳۔ وہ ہنسا اور اپنا ہاتھ شمشیر تک لے گیا اور کہا ہر ملک ہمارا ملک ہے کیونکہ ہر ملک ہمارے خدا کا ملک ہے۔ ۶

بہر حال جب شہر قادس کے نزدیک، وادی لکّہ (Guadalete) کے پاس دونوں فوجوں کا آمنا سامنا ہوا تو راڈرک کے لشکر جرار کو شکست فاش سے دوچار ہونا پڑا۔ حقیقت میں اسی فیصلہ کن معرکہ نے مسلمانوں کو اندلس کا حکمران بنا دیا۔ اس کے فوراً بعد طارق بن زیاد نے قرطبہ، غرناطہ، مالقہ اور دوسرے شہروں اور مضافات کو فتح کر کے اندلس کے دارالخلافہ طلیطلہ میں داخل ہو کر وہاں اسلامی علم لہرایا اور اسلامی حکومت کی بنیاد ڈالی۔

موسیٰ بن نصیر نے بھی سال ۹۳ھ/۷۱۲م میں ایک نئے لشکر کے ساتھ آبنائے جبل طارق کو عبور کیا اور ایک دوسری جگہ فروکش ہوئے جو اب جزیرۂ خضراء (Algeciras) کے نام سے مشہور ہے۔ پھر شذونہ، اشبیلیہ اور ماردہ کو فتح کرتے ہوئے طلیطلہ پہنچ گئے۔ یہاں دونوں قائدوں نے اپنے بعض فروعی مسائل کو حل کرنے کے بعد شمال کی طرف پیش قدمی شروع کی اور کوہ پیرانیز تک سارے اندلس کو فتح کیا۔ سال ۹۵ھ/۷۱۴م میں موسیٰ بن نصیر نے اپنے بیٹے عبدالعزیز کو اندلس کا والی مقرر کیا اور طارق بن زیاد کے ساتھ خلیفہ ولید بن عبدالملک سے ملنے کے لئے دمشق روانہ ہوئے۔ ۷

۷۴۸م میں شام میں اموی خلافت کا خاتمہ ہو گیا۔ مگر قریشی عقاب عبدالرحمٰن الداخل سفاح کے دام سے بچ نکلا اور اندلس پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ یہاں اس نے سلطنت پر قبضہ کر لیا اور ۷۵۶م میں اموی سلطنت کا وہ علم پھر سے لہرایا جسے عباسیوں نے دمشق میں لپیٹ دیا تھا۔ اس سلطنت پر اس کے بعد دو سو چوراسی سال تک اس کی اولاد میں سے انیس خلفاء اس کے جانشین ہوئے۔ اس کے بعد یہ مملکت طوائف الملوکی میں بٹ گئی۔ یہاں تک کہ مرابطین آئے ان کے بعد موحدین آئے پھر آخر میں اندلس میں سمٹتے سمٹتے غرناطہ رہا۔ وہ بھی ۸۹۸ھ/۱۴۹۲ام میں ابوعبداللہ محمد بن علی کے غرناطہ سے فرار ہونے کے بعد مسلمانوں سے چھوٹ گیا۔ اس طرح سے پورے ۸۰۶ سال تک حکومت کرنے کے بعد اندلس سے مسلمانوں کو اپنی ناعاقبت اندیشی اور باہمی اختلافات کی وجہ سے معزول ہونا پڑا۔ 8

اس آٹھ سو سالہ عہدِ حکومت کے بارے میں استاد احمد حسن زیات لکھتے ہیں:

"چنانچہ ہسپانیوں نے عربی ثقافت کو اپنا لیا، عربوں کا دین اختیار کر لیا، ان کی زبان بولنے اور ان کے آداب سیکھنے لگے۔ انہوں نے لاطینی زبان اور اس کے ادب کو اس طرح چھوڑ دیا کہ وہ اسے بالکل بھول گئے۔ حتیٰ کہ قرطبہ کے ایک کاہن کو اس صورتِ حال کا شکوہ کرنا پڑا۔ لیکن پھر یہ سیلاب اس قدر تند و تیز ہو گیا کہ خود مسیحی دینی رہنما بھی اس کے مقابلہ کی تاب نہ لا سکے اور انہیں مجبور ہو کر اپنی دینی کتابوں کو عربی میں منتقل کرنا پڑا"۔ 9

حق بات یہ ہے کہ عصرِ حاضر کی نشأۃ ثانیہ اسی علمی باغ و بہار کی مرہونِ منت ہے۔ علامہ شبلیؒ لکھتے ہیں کہ:۔

"بے شبہ یورپ کی استادی کا فخر اسپین ہی کا خاص حصہ ہے۔" 10

اس حقیقت کا اعتراف کئی یورپی محققین اور مستشرقین نے بھی کیا ہے۔ جیسے آر۔ ڈبلیو۔ ساؤدرن (R. W. Southern) رقمطراز ہیں:

"Talented young christians were reading books in Arabic and were reported to despire the christians literature as unworthy of attention.They also ignored the study of latin and took the Arabic. Arabic books were also translated in latin in large number between the 11th century and 13th Century." 11

(باصلاحیت عیسائی نوجوان عربی کتابوں کا ہی مطالعہ کرتے تھے اور وہ عیسائی لٹریچر سے دل افروختہ ہو کر اسے ناقابل التفات سمجھتے تھے۔ انہوں نے لاطینی زبان کو بھی خیر باد کہا اور عربی زبان سیکھی۔ گیارھویں اور تیرھویں صدی کے درمیان کثرت سے عربی کتابوں کا ترجمہ لاطینی زبان میں کیا گیا۔)

مشہور مغربی فاضل محمد اسد اس سلسلے میں لکھتے ہیں:

"Europe should know this well for its own culture owes to Islam nothing less than the Renaissance ("rebirth") after centuries of darkness." 12

(یورپ کو یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لینی چاہیئے کہ ان کی تہذیب نے صدیوں کی تاریکی کے بعد نشاۃ ثانیہ کو اسلام ہی سے مستعار لیا ہے۔)

مگر اب حال یہ ہے کہ مسلمانوں کے اس فردوسِ گم شدہ (الفردوس المفقود) میں ان کے آثارِ قدیمہ کے سوا اور کچھ باقی نہیں رہا۔ مسجد قرطبہ، الحمراء کا قلعہ اور مدینۃ الزہراء مرثیہ خواں اور ماتم کناں ہیں کہ آخر یہ سب کیا ہوا؟ کیسے ہوا؟ اور کیوں ہوا؟ انہیں دیکھنے والا ہر چشمِ بینا دل ہی دل میں یہ کہتا ہے کہ:

ابھی اس راہ سے کوئی گیا ہے
کہے دیتی ہے شوخی نقشِ پا کی

أمیر الشعراء أحمد شوقی اور شاعرِ مشرق علامہ محمد اقبال بھی اندلس آئے تو امتِ مسلمہ کی عظمتِ رفتہ کے نشاں دیکھ کر دونوں کے جگر خون ہوئے۔ اندلسیات پر مشتمل ان کی شاعری اسی خونِ جگر کا نذرانہ ہے جو انہوں نے خلوص و محبت سے ہمارے سامنے پیش کیا ہے۔

اندلسیات شوقی

جب ۱۹۱۴ء میں پہلی جنگِ عظیم کے شعلے بھڑک اٹھے تو برطانوی استعمار نے مصر میں خدیو عباس حلمی، کو معزول کر کے سلطان حسین کامل کو اس کی جگہ مصر کا حکمران بنا دیا اور ساتھ ہی عباس کے اعوان و حاشیہ برداروں کو بھی حکومت سے دور کرنا شروع کر دیا۔ شوقی چونکہ عباس کے دربار سے وابستہ، عثمانی خلافت کے طرف دار اور وحدتِ اسلامی کے پاس دار تھے۔ انہوں نے برطانوی سامراج کے خلاف فنی مہارت سے بھرپور، دل سے جگر تک اترنے والے زوردار قصائد لکھے جو مصر میں خاص طور پر اور دیگر عرب ممالک ین عام طور پر زبان زدِ خاص وعام ہو گئے۔ لوگوں نے انہیں زبانی یاد کیا اور جلسوں میں گایا۔ اس کی پاداش میں شاعر کو اپنے وطنِ مالوف سرزمینِ مصر سے جلاوطن کیا گیا۔ غریب الوطنی کی یہ زندگی انہیں ۱۹۱۴ء سے ۱۹۲۰ء تک اندلس میں بسر کرنا پڑی۔ [۱۳]

اس غربت میں شاعر کا دل بھر آیا پھر غصب شدہ اسلامی جنت" (الفردوس الاسلامی المغتصب)۔ الأندلس۔ میں امت مسلمہ کی عظمتِ رفتہ کے آثار دیکھے تو کلیجہ منہ کو آیا اور آنکھوں سے آنسو رواں ہوئے۔ اسی درد و کرب کے عالم میں شاعر ان آثار سے سرگوشیاں کرتا ہے وہ آپس میں راز و نیاز کی باتیں کرتے ہیں۔ وہ ان سے طرح طرح کے سوال پوچھتا ہے اور وہ انہیں اپنی ساری روداد سناتے ہیں جیسا کہ شاعر کہتا ہے:

فأخذت أسألُ والرّسومُ تجیبُنی

وفی الإعتبار إجابة و سؤال

یہی روداِ غم مختلف حیثیتوں سے ہمارے شاعر کی اندلسیات کا محور ہے۔ مثلاً (۱) الرّحلة إلى الأندلس، (۲) أندلسيّة، (۳) صَقرُ قریش عبدالرحمن الداخل (۴) دُولُ العرب و عظماء الإسلام،

(۵) بعد المنفى، (۶) أميرة الأندلس اور (۷) الأندلس الجديدة۔

الرحلة إلى الأندلس ان قصائد میں زیادہ مشہور قصیدہ "الرّحلة إلى الأندلس" (اندلس کا

سفر) ہے۔اسے شوقی نے "بحتری" کے قصیدہ سینیہ کی زمین میں لکھا ہے۔ بحتری نے یہ قصیدہ "ایوان کسریٰ" کے وصف میں لکھا تھا۔ بحتری کی شاعری کے اسلوب اور حسن و جمال کو سراہتے ہوئے متنبی نے کہا تھا، "میں اور ابو تمام تو حکیم ہیں اور شاعر تو بحتری ہے۔" ۱۵

بحتری کے اس سینیہ کے چند اشعار درج ذیل ہیں:

۱۔ عکستُ حظّہ اللّیالی و بات　　المشتری فیہ وھو کوکب نحسی

۲۔ فھو یبدی تجلّداً و علیہ　　کلکل من کلاکل الدھر مرسی

۳۔ لیس یدری أصنع إنس لجنّ　　سکنوہ أم صنع جنّ الإنس ۱۶

ترجمہ:۔

۱۔ گردش زمانہ نے اس (ایوان کسریٰ) کا مقدر الٹا کر دیا اور اس کی قسمت مشتری کے برج میں آ گئی، جو منحوس تارہ ہے۔

۲۔ وہ بہادری اور صبر و عظمت کا مظاہرہ کر رہا ہے حالانکہ اس پر زمانہ کے بھاری سینہ کا مستقل بار پڑا ہوا ہے۔

۳۔ یہ بات فہم و ادراک سے پرے ہے کہ اسے انسانوں نے جنوں کے بود و باش کے لئے بنایا تھا یا جنوں نے انسانوں کے لئے۔

شوقی کا سینیہ "الرحلة إلى الأندلس" ایک سو دس (۱۱۰) اشعار پر مشتمل ہے۔ تمام اشعار پُر درد، پر کیف اور رسیلے ہیں۔ ابتدا گردشِ لیل و نہار اور بچپن کی بیتی ہوئی حسین یادوں سے کی ہے:

۱۔ اختلافُ النّھارِ و الّیل ینسي　　اذکرا لي الصّبا، و أیامَ أُنسِي

۲۔ وصفالي مُلاوۃ من شباب　　صوّرت تصوّرات و مسّ

۳۔ عصفتْ کالصّبا اللعوب و مرّت　　سنة حلوة، و لذّة خلسِ ۱۸

ترجمہ:۔

۱۔ گردش زمانہ بہت سے واقعات کو بھلا دیتا ہے۔ اے میرے دوستو! مجھے میرے بچپن اور میری محبت کے دن یاد دلاؤ۔

۲۔ اور کچھ دیر کے لئے میرے سامنے ایامِ شباب کا وصف بیان کرو جو تصورات اور احساس کی

آمیزش سے رونما ہوا تھا۔
۲۔ جو بادِ صبا کی طرح گزر گیا۔ جیسے میٹھی نیند اور آنکھ کی جھپک کے ساتھ اس کی لذت رفو چکر ہو جاتی ہے۔

پھر اپنے وطن عزیز کو بادیدۂ نم یاد کرتے ہوئے کہتے ہیں:

۱۔ وسلا مصرَ: هل سلا القلبُ وعنها أو أسا جُرحَه الزمان المؤسّي؟
۲۔ كلّما مرّتِ الليالي عليه رقّ، والعهدُ في الليالي تُقسِي
۳۔ أحرامٌ على بلابله الدّوْ حُ، حلال للطير من كل جنسِ
۴۔ وطني لو شغلت بالخلد عنه نازعتني إليه في الخلد نفسي
۵۔ شهد الله، لم يغب عن جفوني شخصه ساعة، ولم يخل حسّي [19]

ترجمہ:
۱۔ اے میرے ساتھیو: ذرا مصر سے پوچھو! کیا دل اس کی یاد کو بھلا سکا؟ یا اس کی یاد کے زخم کو وہ زمانہ مندمل کر سکا جو مرورِ ایام کے ساتھ بہت سے زخموں کا مداوا کرتا ہے۔
۲۔ جب بھی راتیں اس پر گزرتی ہیں تو اس کا دل نرم ہو جاتا ہے۔ حالانکہ زمانہ راتوں میں سختی پیدا کرتا ہے۔
۳۔ کیا چمن کے بلبلو کے لئے چمن کے گھنے اور سایہ دار درخت حرام ہیں اور ان کے علاوہ ہر جنس کے پرندوں کے لئے وہ حلال ہیں؟
۴۔ میرے وطن اگر تجھ سے جدا کر کے مجھے جنت میں بھی بھیج دیا جائے تو وہاں بھی میرا دل تیری طرف کھینچتا رہے گا۔
۵۔ خدا گواہ ہے کہ تیرا ماحول پل بھر کے لئے بھی میری آنکھوں اور میرے شعور سے اوجھل نہ ہو سکا۔

پھر شعر نمبر ۴۵ سے شعر نمبر ۵۴ تک شاعر امویوں کے شرف و مجد اور ان کے تخت و تاج کا رونا روتا ہے۔ ان کے خلفاء کے متعلق سوال کرتا ہے جنہیں سلسلۂ روز و شب نے لپیٹ لیا۔ ان کے تاریخی آثار سے سرگوشیاں کرتا ہے جنہیں گردشِ زمانہ نے بوسیدہ کر دیا:

۱۔ أين (مروان) في المشارقِ عرشُ أمَويّ، و في المغارب كرسيّ

٢۔وعظ (البحتری)ایوانُ (کسری)　　وَ شَفَّتَنِي لقصورُ من (عبد شمسي) ٢٠

ترجمہ:

ا۔مروان کہاں ہے جس کی اموی حکومت کا مشرق ومغرب میں دور دورہ تھا۔

٢۔ایوان کسری نے بحتری (شاعر) کو پند ونصیحت کی اور مجھے عبد شمس کے محلات نے تشفی بخش فہمائش سے نوازا۔

اس کے بعد شاعر اسلامی آثار کا ذکر جمیل شروع کرتا ہے۔ شعر نمبر ۵۵ سے شعر نمبر ۶۵ تک شہرِ قرطبہ کے بارے میں کہتا ہے کہ یہ شہر کبھی دنیا میں اپنی ایک منفرد پہچان رکھتا تھا اور اب اس کا حال یہ ہے کہ لوگوں نے اسے فراموش کر دیا ہے۔ مگر شاعر کا وجدان اور تخیل اسے ان محلات کی سیر کراتا ہے جن میں وہ اولوالعزم حکمران رہا کرتے تھے جن کے تدبرِ حکمرانی اور علم دوستی کی وجہ سے شہر قرطبہ علم وادب کا گہوارہ بنا ہوا تھا۔ اسے مشرق ومغرب کے شہروں میں ایک تقدس کا مقام حاصل تھا۔ مگر شاعر کا یہ معاملہ ایسا ہی تھا جیسے خواب میں کسی کے ساتھ خیال کا ہوتا ہے۔ جب وہ بیدار ہو کر شہر کی طرف دیکھتا ہے تو اسے وہاں کوئی غم گسار نظر نہیں آتا اور نہ اس قوم کا کوئی پرسانِ حال دکھائی دیتا ہے:

قرية لا تعدّ في الأرض، كانت　　تمسكُ الأرض أن تميد و تُرسي

وإذا الدارُ مابها من أنيس　　وإذا القومُ مالهم من محس ٢١

ترجمہ:

ا۔جو شہر آج بے حیثیت بنا ہوا ہے وہی کل تک زمین کے لئے باعث رونق تھا۔

٢۔اب اس گھر میں کوئی غم گسار ہی نہیں اور نہ اس قوم کا کوئی پرسان حال ہی ہے۔

شہر قرطبہ کے بعد شوقی مسجدِ قرطبہ کے بارے میں لکھتے ہیں :

ا۔و رقيق من البيوت عتيق　　جاوز الألفَ غير مذموم حَرَس

٢۔*فترة الدهرِ قد كَسَتْ سَطرَيْهَا　　ما اكتسى الهدبُ منفتورو نعس ٢٢

ترجمہ:

ا۔ یہ خوبصورت مسجد جو قدیم، پروقار اور محترم ہے اس کو بنائے ہوئے ایک ہزار سال سے زیادہ عرصہ بیت گیا مگر گردشِ دوراں اس کے جمال وجلال کا بال بیکا نہ کر سکا۔ (اس کی آن

بان اور شان و شوکت ہنوز باقی ہے اور تا ابد باقی رہے گی)

۲۱۔ فتـرۃُ الدهر (درمیان کا زمانہ، تعمیر کرنے کے بعد اجتک کا ایک ہزار سالہ زمانہ) نے اس کے حسن و جمال کو اسی طرح اور زیادہ آراستہ و پیراستہ کیا جس طرح اونگھ یا نیند کے آجانے سے آنکھوں کی پلکیں اور زیادہ بارونق ہو جاتی ہیں۔

اس عظیم الشان تاریخی مسجد کا نقشہ قریش کے شاہین عبدالرحمٰن الداخل نے خود ہی بنایا تھا۔ اس کا سنگِ بنیاد بھی اسی شاہین نے اپنے مبارک ہاتھوں سے رکھا تھا۔ ابھی مسجد مکمل نہ ہوئی تھی کہ عبدالرحمٰن الداخل نے اپنی کبرسنی کو مدنظر رکھتے ہوئے سفید لباس پہن کر مسجد میں نماز جمعہ کا اہتمام کیا۔ لوگ وفورِ شوق میں جوق در جوق نماز جمعہ ادا کرنے کے لئے مسجد میں حاضر ہوئے اور عبدالرحمٰن الداخل نے ایک عارضی ممبر پر چڑھ کر عوام کے سامنے خطبہ دیا۔ اسی مسجد میں موصوف کی نماز جنازہ بھی پڑھی گئی۔

پھر اس کے بیٹے ہشام اوّل نے ۷۹۳ء میں مسجد کو مکمل کروایا۔ مگر ان کے بعد کے حکمران بھی اس کی توسیع و تزئین کا کام کرتے رہے۔[۲۴] اس تمام تاریخ کو شوقی نے ایجاز کے ساتھ صرف ایک شعر میں رقم کیا ہے:

صَنعةُ (الداخل) المباركِ في الغرْ ... بِ، و آلٍ لـه مَيـامِيـنُ شُمُـس

اس کے بعد شوقی نے عالمِ شوق میں شعر نمبر اٹھہتر سے شعر نمبر چورانوے تک سولہ اشعار میں ایک رسّام کی طرح ''قصر الحمراء'' کی منظر کشی کی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ جو کام ایک رسّام الوان سے لیتا ہے شوقی نے وہی کام الفاظ سے لیا ہے:۔

مَن (لِحمراء) جُلِلَتْ بغُبارِ الـ ... دهْرِ، كـالجُرح بين بُرْءٍ ونكس

پھر آہیں بھرتے ہوئے اور گرم گرم آنسو بہاتے ہوئے اندلس سے مسلمانوں کے بے آبرو ہو کر نکلنے کی آئینہ داری کرتے ہیں۔

خَـرَجَ القـومُ فـي كتـائبَ صمّ ... عن حفاظ، كَمُوكب الدَّفْن خُرس

ركِبـوا بـالبحـار نَعْشـاً، و كـانت ... تـحت آبائهم هـي العرش أمس

و إذا مـا أصـاب بنيـان قـوم ... وَهْـيُ خُـلُـقٍ، فـإنـه وَهْـيُ أُسّ [۲۵]

ترجمہ:

۱۔قوم اپنے قلعوں سے خاموش دستوں کی صورت میں نکل پڑی جیسے کوئی جنازہ جارہا ہو۔
۲۔وہ لاشوں کی مانند کشتیوں پر سوار ہوکر وہاں سے نکل پڑے۔جبکہ کل تک وہاں ان کے آبا واجداد حکومت کررہے تھے۔
۳۔جب کسی قوم میں اجتماعی طور پر اخلاقی بگاڑ پیدا ہوجاتا ہے تو وہ اس کی بنیادی کمزوری ہوتی ہے۔(جس سے اس کی چولیں ہل جاتی ہیں، وہ کمزور ہوجاتے ہیں اور ان کی ہوا ہی اکھڑ جاتی ہے۔)

لیکن اس شکست وریخت کے باوجود شوقی یاسیت، قنوطیت اور احساس شکست کا شکار نہیں ہے۔ بلکہ وہ ان تمام حالات وواقعات کو امت کے لئے سبق آموز سمجھتے ہیں۔خود روتے ہیں، اوروں کو رُلاتے ہیں، پھر تسلّیاں دیتے ہیں اور حوصلہ افزائی بھی کرتے ہیں۔وہ چاہتے ہیں کہ مسلمان اپنے ماضی کی طرف توجہ کریں اور اس سے اپنے مستقبل کے لئے سبق حاصل کریں۔کیونکہ ماضی ہمیشہ نصیحتوں کا خزانہ ہوتا ہے:

۱۔حَسْبُهم هذه الطلولُ عظات من جديد على الدهور و دَرْس
۲۔وإذا فاتَكَ إلتفات إلى الما ضي فقد غاب عنك وجه التأسّي ۲۶

ترجمہ:
۱۔ان کے لئے یہ آثار (نشانات، کھنڈرات) ہر نئے دور میں پند و نصیحت کے لئے کافی ہیں۔
۲۔اور جب تمہاری توجہ اپنے ماضی سے ہٹ جائے گی تو تسلّی دینے والا ناصح چہرہ تم سے کافور ہوجائے گا۔

أنـــدَلُسِيّة :ایک طرف شوقی کو اندلس مین مصر کی یاد جھلسائے جارہی تھی اور دوسری طرف اندلس میں مسلمانوں کی شاندار تاریخ اور ان کے سنہری دور پر وہ خون کے آنسو بہارہے تھے۔ ایسے میں وہ اپنا مشہور ''نونیہ'' کہتا ہے جسکا نام ''اَندَلُسِیَّہ'' بھی ہے۔شوقی نے اس کے لئے اندلس کے نمائندہ شاعر ابن زیدون (۳۹۴-۴۶۳ھ) کے مشہور نونیہ کی زمین کا انتخاب کیا ہے۔ابن زیدون نے یہ نونیہ خلیفہ مستکفی کی بیٹی ''ولادۃ'' کی یاد میں لکھا ہے جو اس کی معشوقہ تھی۔جب وہ قرطبہ میں تھی اور شاعر اشبیلیہ میں تھا۔اس کے ہجر میں شوقِ ملاقات کے لئے کہتا ہے:

أصـنـحـى الـتـنـائـى بـديـلا مـن تـدانـيـنـا
ونـاب عـن طـيـب لـقـيـانـا تـجـافـيـنـا
بِـنـتُـم وبِـنّـا فـمـا ابـتـلـت جـوانـحـنـا
شـوقـا إلـيـكـم ولا جـفـتْ مـاقـيـنـا ۲۷

ترجمہ:

ا۔ وصال کی جگہ اب جدائی نے لے لی اور ہماری خوشگوار ملاقات اب فراق میں بدل گئی ہے۔

۲۔ تم ہم سے اور ہم تم سے جدا ہو گئے اور اس کے بعد سے ہمارے پہلوؤں کے آتشِ شوق کو سکون ہی نصیب نہ ہوا نہ ہماری آنکھوں کے آنسو ہی تھمے۔

شوقی نے اس نونیہ کا معارضہ اس لئے پسند کیا کہ دونوں شاعروں کے درمیان ایک مماثلت تھی۔ ابن زیدون ولادہ کی یاد میں آنسو بہاتا ہے اور شوقی اپنے وطنِ عزیز کی جدائی میں روتا ہے۔

شوقی کے اس نونیہ میں ایک اور دلچسپ بات ہے۔ وہ یہ ہے کہ شوقی اپنا اندلسیہ "یانائح (الطلح)" سے شروع کرتا ہے۔ الطلح ایک درخت کا نام ہے۔ اشبلیہ کی ایک وادی اسی نام سے موسوم ہے۔ اسلئے کہ اس میں طلح کے درخت کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ اشبلیہ کا حاکم معتمد بن عباد اس وادی کے ساتھ حد درجہ لگاؤ رکھتا تھا۔ حق یہ ہے کہ وہ اس کا شیفتہ وگرویدہ تھا۔ ابن تاشفین نے اس کی حکومت چھین کر اسے "اغمات" میں قید کر لیا تھا۔ جب اس قید میں عید کے دن اس کی بیٹیاں پھٹے پرانے کپڑوں میں ملبوس اس سے ملاقات کے لئے آئیں تو اس نے یہ اشعار کہے:۔

ا۔ فيما مصنى كنتُ بالأعياد مسروراً — فساءك العيد فى إغمات مأسورا
۲۔ ترى بناتك فى الأطمار جائعة — يَغزلْنَ لِلنّاسِ مايملكن قطميرا
۳۔ يَطَأْنَ فى الطين والأقدام حافية — كأنّها لم تطأ مِسكا و كافورا
۴۔ قد كان دهرك أن تأمره ممتثلا — فردّك الدهر منهيا ومأمورا
۵۔ من بات بعدك فى ملك يُسَرُّبه — فَإنّما بات بالأحلام مغرورا ۲۸

ترجمہ:

۱۔ تو ماضی میں عیدوں کو شاداں و فرحاں مناتا تھا لیکن آج اغمات کی قید میں تجھے عید کاٹ رہی ہے۔

۲۔ تو اپنی شہزادیوں کو پھٹے پرانے لباس میں ملبوس اور بھوکا دیکھ رہا ہے۔ وہ لوگوں کے لئے سوت کاتتی ہیں اور انکے پاس پھوٹی کوڑی بھی نہیں ہے۔

۳۔ وہ ننگے پاؤں کیچڑ میں پیر رکھ کر چلتی ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے پانوؤں نے کبھی مشک و کافور کو روندا ہی نہیں۔

۴۔ ایک وہ بھی دور تھا جب زمانہ تیرے حکم کا تابع تھا اور آج زمانہ نے تجھے محکوم بنا کر بہت سی چیزوں سے محروم کر دیا ہے۔

۵۔ تیری اس حالت کو دیکھنے کے بعد بھی اگر کوئی حکومت پر خوش ہوتا ہے تو وہ خوابوں کے فریب میں مبتلا ہے۔

شوقی اور معتمد بن عباد میں کئی چیزیں قدر مشترک کی حیثیت رکھتی ہیں۔ دونوں غریب الوطن تھے ایک قید میں اور دوسرا جلاوطن۔ دونوں پہلے خوشحال تھے اور اب دونوں کو گردش لیل و نہار نے بدحال اور درماندہ بنا دیا تھا۔

دونوں بڑے شاعر تھے اسلئے دونوں نے اپنے اپنے رنج و غم اور حزن و ملال کو شاعری کا جامہ پہنایا ہے۔

شوقی نے اپنا "اندلسیۃ" "نائح الطلح" کی تلمیح سے شروع کیا ہے:

۱۔ یا نائحَ الطلحِ، أشباهُ عوادِينا　　نَشْجَى لِوَادِيكَ، أم نَأسَى لوادينا؟

۲۔ ماذا تقصّ علينا غير أنّ يداً　　قصّتْ جَناحَكَ جالت في حواشينا؟ [29]

ترجمہ:

۱۔ اے وادی طلح میں آہ و فغاں کرنے والی فاختہ گردشِ دوراں نے ہم دونوں پر ایک جیسے ستم ڈھائے ہیں۔ اسلئے ہم دونوں تمہاری وادی کے لئے آہ و بکا کریں یا ہماری وادی کے لئے نالہ و زاری کریں؟

۲۔ تم ہمیں کونسی داستانِ غم سناؤ گی ماسوائے اس کے کہ جن ہاتھوں نے تمہارے بال و پر تراش لئے ہیں وہی ہاتھ ہمارے گھر کے اردگرد گردش میں ہیں؟

اس تلمیح سے ہم اُس قلق واضطراب کا بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں جس سے شوقی اپنی جلاوطنی کے دوران دوچار تھا۔ پھر سارا اندلسیہ یا نونیہ اسی قلق واضطراب کی غمازی کرتا ہے۔ لیکن وہ اپنے ذاتی دردوغم کی روداد بیان کرتے ہوئے اپنی ملّت کو فراموش نہیں کرتے ہیں:

نحن البواقیت خاض النار جوهرنا　　ولم یهن بید التشتیت غالینا

لم تنزل الشمس میزانا ولا صعدت　　فی ملکها الضخم عرشا مثل وادینا ۳۰

ترجمہ:

۱۔ہم وہ یاقوت ہیں جسے آگ نے جلا کر کندن بنایا ہے اور ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بھی ہماری قدروقیمت میں کمی نہیں آئی ہے۔

۲۔سورج کو اپنی وسیع سلطنت میں ہماری وادی جیسا افق اور شفق نصیب نہیں ہوا۔

وہ اس لئے کہ جب آفتاب طلوع ہوتا ہے تو افق خونِ مسلم سے لال ہوتا ہے اور جب غروب ہوتا ہے تو وہ شام کی دلہن کو مسلمانوں ہی کے خون کی مہندی لگاتا ہے۔ پھر دن بھر تو ہر پھول کی سنہری قبا اسی خونِ ناحق کی سُرخی سے آراستہ وپیراستہ ہوتی ہے۔

خلافت کے ٹوٹ جانے سے تمام مسلم ممالک منتشر ہو گئے۔ ان کے حکمرانوں کی حیثیت استعماریوں کے ہاتھوں میں شطرنج کے مہروں کی سی تھی۔ وہ انہیں اپنے مفاد کو ملحوظ نظر رکھتے ہوئے جہاں چاہتے رکھ لیتے اور جب چاہتے ہٹا لیتے۔ پھر وادیِ طلح کی فاختہ صبح کا نغمہ کیسے چھیڑتی جبکہ رات ابھی باقی تھی۔ شوقی طرب کے گیت کیسے گاتا جبکہ غم کی بات باقی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ دونوں مل کر آہ وزاری کرتے ہوئے خون کے آنسو بہاتے ہیں۔

صَقرُ قُریش: شوقی اندلس کی اسلامی تاریخ میں عبدالرحمٰن الداخل کو بڑی اہمیت دیتے ہیں۔ وہ اس بطلِ جلیل کو "صَقرُ قُرَیش" (قریش کا شاہین) کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔ چنانچہ اس نے اندلسی موشحات کے طرز پر "صَقرُ قُرَیش" (عبدالرحمٰن الداخل) کے عنوان سے ایک سو بتیس (۱۳۲) اشعار پر مشتمل ایک مشہور ومعروف قصیدہ لکھا ہے۔

اس قصیدہ کو شوقی نے لسان الدین بن الخطیب کے موشح سے متاثر ہو کر لکھا ہے۔ جس کا مطلع ہے:

جادك الغيث إذا الغيث هَمَى　　يا زمان الوصل بالأندلس

لم يكن وصلك إلا حُلُما　　في الكرى أو خلسة المختلس ۳۱

ترجمہ:

۱۔اے سرزمین اندلس کے وصل کے زمانے بارش تجھے خوب سیراب کرے جبکہ وہ موسلا دھ

برس رہی ہو۔

۲۔تمہارا وصل نیند میں ایک خواب یا آنکھ چرانے والے کے آنکھ چرانے کے سوا اور کچھ نہ تھا

شوقی کے قصیدہ ''صقر قریش'' کا مطلع ہے:

۱۔مَنْ لِنِضْوٍ يَتَنَزّىٰ أَلَماً   بَرَحَ الشَّوْقُ بِهِ فِي الْغَلَسِ

۲۔حَنَّ لِلْبَانِ وَنَاجَى الْعَلَما   أَيْنَ شَرْقُ الْأَرْضِ مِنْ أَنْدَلُسِ ۲۲

ترجمہ:

۱۔اس دُبلے پتلے شخص کے برابر کون ہوسکتا ہے جو آتشِ غم میں بے خطر کود پڑا اور رات

تاریکی میں شوق برابر اس کے ساتھ رہا۔

۲۔وہ جدائی کا عاشق ہوگیا اور اس نے نشانِ راہ کے ساتھ سرگوشیاں کیں، کہاں سرزمی

مشرق اور کہاں اندلس۔

عبدالرحمٰن الداخل ایک بڑے شاعر تھے، مردِ میدان تھے، قریشی عقاب تھے او

ایک کامیاب حکمران تھے۔اس موشح میں شوقی نے اس انسان کامل کے جذبات کی کامیاب

ترجمانی کی ہے، اس کی جواں مردی کو خوب سراہا ہے اور اس کے کارناموں کی بہترین منظر

کی ہے۔

بُلْبُلٌ عَلَّمَهُ البينُ البيانْ   بَاتَ فِي حَبْلِ الشجونِ ارْتَبَكا ۲۳

ترجمہ: ایک ایسا بلبل کہ جسے جدائی نے چہکنا سکھایا۔اس نے راتِ غم واندوہ کے پھند

میں دلیری سے بسر کی۔

شوقی اس قریشی عقاب کو دلیری اور شرافت کے رمز کی حیثیت سے پیش کرتا ہے۔اسلئے کہ

''شبابِ مشرق ہے، عنوانِ شباب ہے اور ساتھ ہی عمدہ وخالص حسب ونسب کا چشم و چرا

بھی ہے۔''

يا شبابَ الشرقِ عنوانَ الشبابِ ۰ ثمراتِ الحسبِ الزاكي النمير ۲۴

اس پیکرِ جمال وجلال کی حیثیت کتابِ فخر میں یکتا و یگانہ ہے:

فِي كِتَابِ الفَخْرِ لِلداخلِ بابٌ لَمْ يَلِجْهُ مِنْ بَنِي المُلْكِ أميرٌ ۳۵
فخر کی کتاب میں عبدالرحمٰن داخل کے لئے ایک ایسا باب ہے جس میں کوئی شاہ زادہ داخل نہ ہوا۔

اس کی جواں مردی کو سراہتے ہوئے شوقی کہتا ہے کہ وہ صرف سرداری کے لئے پیدا کیا گیا تھا۔ مشرق میں (ملکِ شام میں) راتوں نے اس پر حکومت کرنی چاہی لیکن اس نوجوان نے ان کے خلاف جدوجہد کی اور اپنی منزل کی طرف گامزن رہا یہاں تک کہ مغرب میں (سرزمینِ اندلس میں) ان پر حکومت کی:

۱۔ ذلكَ الناشئُ في خيرِ الأُمَمِ ساد في الأرضِ ولَمْ يُخلَقْ يُساد
۲۔ سُلِبَ العِزُّ بِشَرْقٍ فَرَمى جانبَ الغَرْبِ لِعزٍّ أَقْعَسِ
۳۔ و إذا الخَيْرُ لِعبدٍ قُسِما سَنَحَ السَّعدُ له في النَّحسِ ۳۶

ترجمہ:

۱۔ خیر امم میں اس نوجوان نے دنیا میں سرداری کی۔ وہ اس لئے پیدا نہیں کیا گیا تھا کہ اس پر سرداری کی جاتی۔

۲۔ مشرق سے عزت چھینی گئی تو اسے مغرب کی طرف پھینکا گیا تا کہ وہ اور زیادہ تونگر ہو جائے۔ (یعنی عبدالرحمٰن الداخل)

۳۔ جب کسی بندے کے لئے بھلائی کو تقسیم کیا جاتا ہے تو ناموافق حالات میں بھی اس کے لئے سعادت مندی نمودار ہو جاتی ہے۔

شوقی اپنے ہیرو (Hero) کی آخری خوابگاہ کے متعلق لکھتا ہے:

قَصْرُكَ المُنْيَةُ مِن قُرطُبَة فيه واروكَ، ولِلّهِ المَصِير
صدفٌ خُطَّ على جوهرة بَيْدَ أنّ الدهر نبّاش بصير
لَمْ يَدَعْ ظلّاً لقصرِ المُنيةِ وكذا عُمْرُ الأمانِيِّ قصير
كنتَ صقراً قُرشِياً عَلَما ما على الصقرِ إذا لَمْ يُرْمَس
إنْ تَسَلْ: أينَ قبورُ العُظَما؟ فعلى الأفواه أو في الأنفس ۳۷

۱۔ تمہارے ارمانوں کا محل قرطبہ میں ہے جس میں لوگوں نے تمہیں دفنایا، اور اللہ ہی کی طرف

تو پلٹنا ہے۔
۲۔ (یہ محل) ایک سیپی ہے جو ایک جوہر پر معتین ہے۔ اسلئے کہ زمانہ ایک باخبر کفن چور ہے۔
۳۔ اس (زمانہ) نے کسی ارمانوں کے محل کے سایہ تک کو نہ چھوڑا۔ اس طرح آرزوؤں کی مہلت کم ہی ہوتی ہے۔
۴۔ آپ تو ایک پروقار شخصیت قریشی شاہین تھے۔ شاہین کے لئے ضروری نہیں کہ اگر اس کو دفنایا نہ جائے۔
۵۔ اگر تو پوچھے کہ بڑے لوگوں کی قبریں کہاں ہیں؟ سو وہ یا تو موضوع گفتگو ہیں یا دلوں میں ہیں۔

اس موشح میں شاعر کا عاطفہ قوی ہے، اس کی شخصیت واضح ہے اور اس کا فن ممتاز ہے۔ علاوہ ازیں الفاظ کی صوتیاتی مناسبت اور موسیقیت بے مثال ہے۔

شوقی نے اپنی جلاوطنی کے دوران اندلس میں ہی اپنا طویل ارجوزہ "**دول العرب و عظماء الاسلام**" لکھا ہے۔ اس میں ہمارا شاعر لسان الدین بن الخطیب کے اُرجوزہ "رقم الحلل فی نظم الدول" سے متاثر نظر آتا ہے۔ ۳۸ اس کا ذکر ہم نے اس کی نعتیہ شاعری کے باب میں کیا ہے۔ اس اُرجوزہ کو قاہرۃ سے "مطبعة مصر" نے ۱۹۳۳ء میں شائع کیا ہے۔

أميرةُ الأندُلُس: اندلس کے متعلق شوقی نے ایک نثری ڈرامہ بھی لکھا ہے جس کا نام "**أمیرۃ الأندلس**" ہے۔ یہ اندلس کی بربادی اور مسلمانوں کے ہاتھ سے اس کے زائل ہو جانے کی روداد ہے اس میں معتمد بن عباد اور اس کی بیوی رمیکیہ کی داستان کو ایک دلچسپ ڈرامائی انداز میں بیان کیا گیا ہے۔

بَعدَ المَنفی: جب شوقی اپنی جلاوطنی کے بعد مصر واپس لوٹے تو "بعد المنفی" کے نام سے ایک اور قصیدہ لکھا جس میں اندلس کی جدائی کے غم اور اپنے وطن مالوف میں واپس آنے کی خوشی کا ملا جلا تاثر پایا جاتا ہے۔ سرزمین اندلس نے اسے مشکل حالات میں پناہ دی اور مہمان نوازی کی اسلئے روتے ہوئے اسے الوداع کیا۔ اس کی خوبیوں کو سراہا، اس کے فطری حسن و جمال کی داد دی اور اس کی مہمان نوازی کا شکریہ ادا کیا۔ اس قصیدہ کو شوقی نے ۱۹۲۰ء میں "الأوبرا الملكية" میں منعقدہ ایک اجتماع میں سنایا۔ اس کا مطلع ہے:

أنادي الرسمَ لو ملكَ الجوابا　　و أجزيهِ بدمعي لو أثابا ۳۹

ترجمہ:۔ میں گھر کے مٹے ہوئے نشانات کو پکارتا ہوں اگر وہ جواب دے سکیں اور میں بدلہ میں انہیں اپنے آنسو پیش کرتا ہوں اگر وہ انہیں شرفِ قبولیت بخشیں۔

مزید کہتے ہیں:۔

وقلَّ لحقّه العبراتُ تجري　　و إن كانت سوادَ القلب ذابا ۴۰

ترجمہ:اس کے حق میں یہ بہنے والے آنسو کم ہی ہیں۔ اگر چہ دل ہی پگھل گیا ہو۔

سرزمین اندلس کو رخصت کرتے ہوئے کہتے ہیں:

۱۔و داعاً أرض أندلسٍ، وهذا　　ثنائي إن رضيتِ به ثوابا

۲۔و ما أثنيتُ إلا بعد علمٍ　　و كم من جاهلٍ أثنى فعابا ۴۱

ترجمہ:

۱۔اے سرزمین اندلس تجھے میں الوداع کہہ رہا ہوں اور یہ (تمہارے حق میں) میری تعریف ہے اگر تو اسے اچھا سمجھے اور شرف قبولیت بخشے۔

۲۔ میں نے تمہاری تعریف جان کاری کے بعد ہی کی ہے۔ ورنہ کتنے جاہل ہیں جو تعریف کرتے ہیں پھر عیب نکالتے ہیں۔

جب اندلس کے مسلمان اخلاقی بگاڑ میں مبتلا ہو گئے تو انہیں بے آبرو ہو کر وہاں سے نکلنا پڑا۔ اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کتنا اچھا حکیمانہ شعر کہا ہے:

وليس بعامرٍ بنيانُ قوم　　إذا أخلاقُهُم كانت خرابا ۴۲

ترجمہ: کسی ایسی قوم کی دیوار کی عمر زیادہ نہیں ہوتی جب اس کے اخلاق خراب ہوں۔ پھر اپنے وطن سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں:

۱۔و يا وطني، لقيتُكَ بعد يأسٍ　　كأني قد لقيتُ بك الشبابا

۲۔و كل مسافر سيؤوب يوماً　　إذا رُزِق السلامةَ و الإيابا ۴۳

ترجمہ:

۱۔اے میرے وطن میں تم سے مایوسی کے بعد ملا ہوں۔ گویا کہ میں نے تم سے جوانی میں ملاقات کی ہے۔

۲۔ ہر کوئی مسافر ایک دن واپس لوٹتا ہی ہے اگر اس کو سلامتی اور واپسی عنایت ہو جائے۔
قصیدہ کے آخر میں نیکی، رسالت اور کتاب اللہ کا ذکر اپنے مخصوص حکیمانہ انداز میں کرتے ہیں:

ولولا البرُّ لَمْ يُبْعَثْ رسولٌ   وَلَمْ يُحْمَلْ إلى قومٍ كتابا ۴۴

ترجمہ:۔
اگر نیکی نہ ہوتی تو کوئی رسول نہ بھیجا جاتا اور نہ کسی قوم کو (منجانب اللہ) کوئی کتاب ہی عنایت کی جاتی۔

الأندلس الجديدة

جب کسی بلد اسلامی کو کوئی گزند پہنچتا تو شوقی نہایت درجہ اداس ہوتے۔ اپنی شاعری میں اس کا رونا روتے اور اپنے ساتھ ہر دردمند دل کو بھی رلاتے۔ ۱۹۱۲ء میں مقدونیہ کے شہر اَدرنہ پر بلغاریہ نے قبضہ کر لیا۔ یہ شہر خلافت عثمانیہ کے لئے بڑی اہمیت کا حامل تھا۔ یہاں آلِ عثمان کے اکثر سلاطین مدفون ہیں۔ ابھی اندلس کا زخم مندمل نہ ہوا تھا کہ اَدرنہ کے کھو جانے سے مسلمانوں کو ایک اور زخمِ کاری لگا۔ یہ دل دوز اور جگر سوز خبر سن کر شوقی تڑپ اٹھا۔ اس نے ایک سو پانچ اشعار پر مشتمل ''الأندلس الجديدة'' کے عنوان سے اس پر قصیدہ لکھا۔ ۴۵

سارا قصیدہ محبت و دل سوزی اور حکمت و بصیرت سے لبریز ہے۔ اس میں امت کے سفینے کو گرداب سے نکالنے اور اسے ساحلِ مراد تک پہنچانے کے گر بھی بتائے گئے ہیں۔ شوقی اس میں فن کی اعلیٰ تر اور ارفع تر بلندیوں کو چھو رہے ہیں۔ صدق عاطفہ، رفعتِ شعور اور نسقِ فنی میں یہ قصیدہ ممتاز ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

۱۔ يا أختَ أندلُسَ، عليكِ سلامُ   هَوَتِ الخلافةُ عنكِ، والإسلامُ
۲۔ نزَلَ الهلالُ عَنِ السماءِ، فليتها   طُوِيَتْ، وعمَّ العالمين ظلامُ
۳۔ بِكُما أُصيبَ المسلمون، وفيكما   دُفِنَ اليراعُ، و غُيِّبَ الصَّمصامُ

ترجمہ:۔
۱۔ اے اندلس کی بہن! تجھ پر اللہ کی سلامتی ہو۔ تیرے زائل ہو جانے سے اسلام اور خلافت کو

نقصان پہنچا۔
۲۔ ہلال آسمان سے اتر پڑا، اے کاش کہ اسے چھپا دیا جاتا اور اس کائنات میں تاریکی عام ہو جاتی۔
۳۔ تم دونوں (اندلس اور اَدرنہ) کے زائل ہو جانے کی وجہ سے مسلمانوں کو سخت تکلیف پہنچی، قلم دفن کر دیا گیا اور تلوار غائب کر دی گئی۔
عیسائیوں نے ادرنہ کو فتح کر کے مسلمانوں پر ظلم و بربریت کے پہاڑ توڑے۔ اس پر شوقی حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے یوں عرضِ حال کرتے ہیں:

ا۔ عیسیٰ، سبیلك رحمة و محبّة	في العالمین، وعصمة و سلامُ
۲۔ یا حامل الآلامِ عن هذا الورٰی	کثُرت علیه باسمك الآلامُ ۴۶

ترجمہ:۔
ا۔ اے حضرت عیسیٰ آپ کا راستہ تو دنیا میں رحمت و محبت اور پارسائی و سلامتی کا تھا۔
۲۔ اے دنیا کے مصائب کو اپنے کندھے پر اٹھا لئے جانے والے (یہ صرف نصاریٰ کا عقیدہ ہے) اب خود تیرے ہی نام پر عالمِ انسانیت پر مصائب توڑے جاتے ہیں۔
ان حالات میں شوقی مسلمانوں کو فاتحِ اندلس، طارق بن زیاد کا موقف اختیار کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔ جو صبر و ثبات اور سچے مجاہدانہ ذوق و شوق کا موقف ہے، جو اقدام کا موقف ہے، جو دشمن پر آگے بڑھ کر حملہ کرنے، اسی سے آلاتِ حرب و ضرب چھیننے اور اسی سے سامانِ خورد و نوش حاصل کرنے کا موقف ہے۔ اسی سے ناامیدی کی بدلیاں چھٹ جاتی ہیں، اسی سے رکاوٹیں دور ہو جاتی ہیں، اسی سے اللہ کی نصرت حاصل ہو جاتی ہے اور مستقبل روشن و تابناک بن جاتا ہے ورنہ ناامیدی کے ساتھ زندگی بسر کرنا موت کے مترادف ہے:

وَقَفَ الزمانُ بکم کموقفِ "طارقٍ"	الیأسُ خَلفٌ، والرجاءُ أمامُ

ترجمہ: زمانہ نے تمہیں (اسی طرح) کھڑا کیا جس طرح طارق بن زیاد کو کھڑا کیا تھا کہ ناامیدی پیچھے ہے اور امید آگے ہے۔
اب نہ اَدرنہ کی فضائیں اذانوں سے مسحور ہوتی ہیں، نہ وہاں جمعہ کی نمازوں کا

اہتمام کیا جاتا ہے۔ بلکہ مسجدوں میں چراغ گُل ہوتے ہیں۔کوئی نمازی بھی اس طرف نہیں
جاتا ہے۔اس صورتحال کو دیکھ کر شوقی شہرِ ادرنہ سے کہتے ہیں:

صبراً أدرنة! كلُّ ملكٍ زائلٌ   يوماً، و يبقى المالكُ العلاّمُ

ترجمہ:

اے ادرنہ! صبر کر، ہر سلطنت ایک دن ختم ہو جانے والی ہے اور صرف ایک مالکِ علام کی
ذات ہی باقی رہ جانے والی ہے۔

اندلسیاتِ اقبال

علامہ محمد اقبال کو اندلس کی زیارت کا بڑا شوق تھا۔ وہ اس لئے کہ اسلامی تاریخ میں اس کا ایک خاص مقام ہے۔ اندلس اُس وقت علم و ادب اور تہذیب و تمدن کا گہوارہ تھا جبکہ سارا یورپ جہل و خمول کی تاریکی میں بھٹکتا پھر رہا تھا۔ صرف اتنا ہی نہیں بلکہ اسلامی اندلس ہی کو یورپ کی استادی کا شرف حاصل ہے اور اندلس ہی نشاۃ ثانیہ کا رائد بھی ہے۔

چنانچہ اقبال تیسری گول میز کانفرنس سے فارغ ہونے کے بعد اندلس گئے اس سلسلے میں سیّد ابوالحسن علی ندوی لکھتے ہیں:

(انہوں نے) ''۳۱-۱۹۳۰ء کی گول میز کانفرنس میں مسلمانوں کی نمائندگی کی، لندن میں انہیں فرانس، اسپین اور اٹلی کی حکومتوں نے ملکی دورے کی دعوت دی۔ چنانچہ آپ موخر الذکر دونوں ملکوں کی دعوت پر گئے، اور میڈرڈ میں ''اسلامی آرٹ'' پر چند خطبات دیئے، مسلمانوں کی صدیوں کی جلاوطنی کے بعد مسجد قرطبہ میں پہلی بار نماز پڑھی اور عربوں کی آٹھ سو سالہ حکومت اور ان کے اقبالِ رفتہ کی یاد میں آٹھ آٹھ آنسو روئے اور دل کے پھپھولے پھوڑے۔'' ۴۹؎

فقیر سید وحید الدین لکھتے ہیں: ''وہاں اسلامی دور اقتدار ختم ہونے کے تقریباً سات سو سال بعد انہوں نے مسجد قرطبہ میں پہلی بار اذان دی اور نماز پڑھی''۔ ۵۰؎

اقبال نے اندلس میں قرطبہ، غرناطہ، اشبیلیہ، طلیطلہ اور میڈرڈ کو دیکھا۔ قرطبہ کی تاریخی مسجد اور غرناطہ کے قصر الحمراء کو بھی دیکھا اس کے علاوہ مدینۃ الزہرا کے کھنڈر بھی دیکھے۔ انہوں نے ان شہروں کے ساتھ باتیں کیں۔ باقی رہنے والے تاریخی آثار کے پاس بیٹھے، ان سے سرگوشیاں کیں، خون کے آنسو روئے اور اپنا درد جگر اشعار میں پرو دیا۔ جو ایمان و عاطفہ، وجدان و محبت اور فکر و فلسفہ کا ایک خوبصورت گلستان ہے۔ گلستانِ اندلس کے متعلق اس قبیل کی چھ (۶) نظمیں ''بال جبریل'' مین شائع ہو چکی ہیں جو درج ذیل ہیں:

(۱) دُعا (۲) مسجد قرطبہ (۳) قید خانہ میں معتمد کی فریاد، (۴) عبدالرحمٰن اوّل کا بویا ہوا کھجور

کا پہلا درخت سرزمینِ اندلس میں، (۵) ہسپانیہ اور (۶) طارق کی دعا۔ اس کے علاوہ اُدرنہ پر بھی ''محاصرۂ اُدرنہ'' کے عنوان سے ایک نصیحت آموز نظم لکھی ہے۔

دُعا:۔

ا۔ دُعا:۔ اقبال کی پہلی پر کیف و پر سوز نظم ہے جسے موصوف نے مسجد قرطبہ ہی میں لکھا ہے۔ یہ دعا ایک مجروح اور ٹوٹے ہوئے دل کی مناجات ہے:

ہے یہی میری نماز، ہے یہی میرا وضو
میری نواؤں میں ہے میرے جگر کا لہو
صحبتِ اہلِ صفا، نورو حضور و سُرور
سرخوش و پُر سوز ہے لالہ لبِ آبجُو
راہ محبت میں ہے کون کسی کا رفیق
ساتھ مرے رہ گئی، اک مری آرزو

شاعر خشوع وخضوع اور تضرّع کے ساتھ بارگاہِ الٰہی میں اظہارِ تمنا کرتا ہے:

میرا نشیمن نہیں درگہ میرو وزیر!
میرا نشیمن بھی تو، شاخِ نشیمن بھی تو
تجھ سے مری زندگی سوزو تب و درد و داغ!
تو ہی مری آرزو، تو ہی مری جستجو!
پھر وہ شرابِ کُہن مجھ کو عطا کر، کہ میں
ڈھونڈ رہا ہوں اسے توڑ کے جام و سبُو!
چشمِ کرم ساقیا، دیر سے ہیں منتظر
جلوتیوں کے سبُو، خلوتیوں کے کدو

اس نظم کا ہر شعر اپنے سوز و گداز کی وجہ سے اپنے قاری یا سامع کے دل کی اتھاہ گہرائیوں میں اتر جاتا ہے۔

۲۔ مسجد قرطبہ

مسجدِ قرطبہ، صقرِ قریش۔ عبدالرحمٰن الداخل۔ کی تعمیر کردہ عظیم الشان، تاریخی اور تاریخ ساز مسجد ہے۔ اس کی ساخت میں پاکیزہ محبت کے احساسات، اسلامی فن تعمیر کی عبقریت اور اسلامی آرٹ کا اعجاز ہے۔ اس کے جلال و جمال، اس کے حسن کی رعنائی و یکتائی اور اس کے تاریخی پسِ منظر نے اقبال پر غیر معمولی اثر ڈالا۔ سیّد ابوالحسن علی ندوی اس سلسلہ میں لکھتے ہیں:

''اس حسین لیکن عبرت انگیز و حسرت خیز منظر، تاریخ کی اس یادگار و شاہکار اور اس عظیم مسجد نے (جس کا منبر خطبوں سے جس کے صحن و محراب سجدوں سے اور جس کے منارے اذانوں سے صدیوں سے محروم چلے آ رہے تھے) اقبال کے دل کا ایک ایک تار چھیڑ دیا اور ان کے غیر مندمل زخموں کو کرید کر اور ہرا کر دیا، ان کے احساسات کے سمندر میں ایمان و عرفان، ذوق و شوق، نغمات و الحان، کے ساتھ ہی آلام و احزان کی موجیں اٹھنے اور لہریں بیدار ہونے لگیں، اور اس پس منظر میں ان کی عظیم نظم ''مسجد قرطبہ'' تیار ہوئی جس کا اکثر حصہ قرطبہ میں لکھا گیا اور سرزمینِ اندلس ہی میں تمام ہوئی۔'' ۵۲

''روائعِ اقبال'' کے مترجم مولوی شمس تبریز خاں صاحب اس نظم پر ایک عمومی تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اگر اقبال کی چند منتخب اور نمائندہ نظموں کا نام لیا جائے تو ''مسجد قرطبہ'' ان میں سے ایک اور سرفہرست ہوگی، اور شائد یہ کہنا صحیح ہوگا کہ اقبال کے فن و شخصیت، اور ان کے مجموعی ورثے میں یہ نظم ان کے واحد شاہکار کا حکم رکھتی ہے، اور اردو ادب کے ناقدین کا متفقہ فیصلہ بھی اسی خیال کے حق میں ہے۔'' ۵۳

ڈاکٹر یوسف حسین خان اس نظم کے متعلق لکھتے ہیں:

''اس میں آرٹ، تاریخ اور فلسفہ ایسی خوش اسلوبی سے سموئے گئے ہیں کہ انسانی ذہن لطف اندوز ہوتا ہے اور داد دیتا ہے۔ وہ تفصیل سے ہسپانیہ کی اسلامی عہد کی تاریخ نہیں بیان کرتا بلکہ صرف چند اشارے کرتا ہے۔ یہ چند اشارے ضخیم کتابوں پر بھاری ہیں۔'' ۵۴

یہ ادبی شاہکار ایک ترکیب بند نظم ہے۔ اس کے آٹھ بند ہیں اور ہر بند کا ایک مرکزی خیال ہے۔ پھر اس نظم کا بھی ایک مرکزی عمود ہے جس کے ساتھ یہ آٹھوں بند معنوی

لحاظ سے مربوط ہیں۔ اس میں فنِ شاعری کی تمام خوبیاں بیک وقت جمع ہوگئی ہیں۔

ا۔ پہلے بند میں سلسلۂ روز و شب کی حقیقت اور کارِ جہاں کی بے ثباتی کو بیان کرتے ہیں:

سلسلۂ روز و شب نقش گر حادثات
سلسلۂ روز و شب، اصل حیات و ممات
آنی و فانی تمام معجزہ ہائے ہنر!
کارِ جہاں بے ثبات کارِ جہاں بے ثبات
اول و آخر فنا ظاہر و باطن فنا
نقش کہن ہو کہ نو منزلِ آخر فنا!

۲۔ دوسرے بند میں بندۂ مومن کی نقش گری کو "فنا" کے اس رسمِ عام سے مستثنیٰ قرار د
ہیں۔ اسلیئے کہ بندۂ مومن یا مردِ خدا کا عمل عشق و محبت اور ایمانی حرارت سے فروغ پاتا
جو اس میں ثبات و دوام پیدا کرتا ہے:

ہے مگر اس نقش میں رنگِ ثباتِ دوام
جس کو کیا ہو کسی مردِ خدا نے تمام
مرد خدا کا عمل عشق سے صاحب فروغ
عشق ہے اصل حیات، موت ہے اس پر حرام
عشق کے مضراب سے نغمۂ تارِ حیات
عشق سے نورِ حیات، عشق سے نارِ حیات

۳۔ اس تمہید کے بعد تیسرے بند میں اقبال مسجد قرطبہ سے خطاب کرتے ہیں "اے حر
قرطبہ تیرا وجود بھی اسی پاک محبت سے ہے:

اے حرمِ قرطبہ! عشق سے تیرا وجود
عشق سراپا دوام جس میں نہیں رفت و بود

۴۔ چوتھے بند میں اس وقیع و رفیع مسجد کی شان و شوکت کو بیان کرتے ہوئے اسے مردِ مومن
کی تعمیر اور اس کے معانی کی مادی تفسیر قرار دیا ہے۔ اس کے ساتھ ملت اسلامیہ کی بقا کا مژد

بھی سنایا ہے۔ سیّد ابوالحسن علی ندوی اس کے متعلق رقم طراز ہیں:

''وہ کہتے ہیں کہ یہ مسجد ملت اسلامیہ کے افکار و خیالات، اس کے عزائم اور معتقدات کی ایک تجلی ہونے کی وجہ سے اس کی نمائندہ ہے۔ جس طرح یہ ملت ملک و وطن، نسل و قومیت کے غیر حقیقی اور محدود تصورات سے بری ہے، اسی طرح یہ مسجد بھی عرب و عجم کے حسین امتزاج اور آفاقی میل میلاپ کا نمونہ ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ مومن کا وطن، زمینی حدود سے بے نیاز اور اس کے آفاق بیکراں ہیں۔ اور اس کے پیغام کا سوز و ساز مشرق و مغرب دونوں کو محیط ہے، عراق کے دجلہ و فرات، ہندوستاں کے گنگ و جمن، یورپ کے ڈینوب و بحر روم اور مصر کا دریائے نیل اس کے بحر بیکراں اور محیط اعظم کی ایک موجِ خوش خرام ہیں، تاریخ میں اس کے شاندار اور عظیم الشان کارناموں اور فتح و ظفر کی داستانوں کی مثالیں نایاب ہیں، اسی امت نے عصرِ کہن کو اذنِ رخصت دے کر دورِ جدید کا آغاز اور عہدِ نو کا افتتاح کیا۔'' ۵۵

تیرا جلال و جمال، مرد خدا کی دلیل
وہ بھی جلیل و جمیل، تو بھی جلیل و جمیل
تیری بنا پائدار تیرے ستوں بے شمار
شام کے صحرا میں ہو جیسے ہجومِ نخیل
تیرے درو بام پروادیِ ایمن کا نور
تیرا منارِ بلند جلوہ گہِ جبرئیل
مٹ نہیں سکتا کبھی مرد مسلماں کہ ہے
اس کی اذانوں سے فاش سرِ کلیم و خلیل
اس کی زمیں بے حدود اس کا افق بے ثغور
اس کے سمندر کی موج، دجلہ و دنیوب و نیل
اس کے زمانے عجیب، اس کے فسانے عجیب
عہد کہن کو دیا اس نے پیامِ رحیل

۵۔ پانچویں بند میں مسجدِ قرطبہ سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ تو مردِ مومن کے خوابوں کی تع
اور اس کے عزائم کی تفسیر ہے:

تجھ سے ہوا آشکار بندۂ مومن کا راز — اس کے دنوں کی تپش، اس کی شبوں کا گداز
ہاتھ ہے اللہ کا، بندۂ مومن کا ہاتھ — غالب و کار آفریں، کارکشا کارساز
خاکی و نوری نہاد بندۂ مولیٰ صفات — ہر دو جہاں سے غنی اس کا دلِ بے نیاز

۶۔ چھٹے بند میں اقبال پُر درد لہجے میں فرماتے ہیں کہ سرزمینِ اندلس اگرچہ ہمدوشِ ثریا ہے
اس کے باوجود صدیوں سے اس کی فضا اذانوں سے محروم چلی آ رہی ہے۔ یورپ میں
انقلاب کی ہوا چل رہی ہے مگر یہاں اس کا کوئی اثر نہیں:

دیدۂ انجم میں ہے تیری زمیں آسماں — آہ کہ صدیوں سے ہے تیری فضا بے اذاں
کون سی وادی میں ہے، کون سی منزل میں ہے — عشقِ بلا خیز کا قافلۂ سخت جاں
دیکھ چکا المنی شورشِ اصلاحِ دین — جس نے نہ چھوڑے کہیں نقشِ کہن کے نشاں
حرفِ غلط بن گئی عصمتِ پیرِ کنشت — اور ہوئی فکر کی کشتیِ نازک رواں
چشمِ فرانسیس بھی دیکھ چکی انقلاب — جس سے دگرگوں ہوا مغربیوں کا جہاں
ملتِ رومی نژاد کہنہ پرستی سے پیر — لذتِ تجدید سے وہ بھی ہوئی پھر جواں

روحِ مسلماں میں ہے آج وہی اضطراب
رازِ خدائی ہے یہ کہہ نہیں سکتی زباں

۷۔ ساتویں بند میں وہ پھر مسجدِ قرطبہ سے مخاطب ہوتے ہیں اور کہتے ہیں کہ تو اربابِ فن کا
کعبہ ہے، تو دینِ مُبین کا دبدبہ ہے اور تجھ سے سرزمینِ اندلس حرم مرتبت ہوئی۔ تیرے حسن
جمال کی اگر کوئی مثال مل سکتی ہے تو وہ صرف قلبِ مسلم اور دلِ مومن میں ہے۔

کعبۂ اربابِ فن! سطوتِ دینِ مبیں — تجھ سے حرم مرتبت اندلسیوں کی زمیں
ہے تہِ گردوں اگر حُسن میں تیری نظیر! — قلبِ مسلماں میں ہے اور نہیں ہے کہیں
آہ وہ مردانِ حق! وہ عربی شہسوار — حاملِ خلقِ عظیم، صاحبِ صدق و یقیں
جن کے لہو کی طفیل آج بھی ہیں اندلسی — خوش دل و گرم اختلاط سادہ و روشن جبیں

۸۔ آٹھویں بند میں شاعر قرطبہ کی نہر وادی الکبیر کے کنارے ماضی کے آئینے میں مستقبل کے

ئے درخشاں کو دیکھ رہا ہے۔ گویا وہ اقدار کے اسرار اور سُننِ کَون کے امین ہیں۔ وہ الہامی رنگ میں مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کی پیشگوئی کر رہے ہیں۔

آبِ روانِ کبیر! تیرے کنارے کوئی — دیکھ رہا ہے کسی اور زمانے کا خواب
عالمِ نو ہے ابھی پردۂ تقدیر میں — میری نگاہوں میں ہے اس کی سحر بے حجاب
پردہ اٹھا دوں اگر چہرۂ افکار سے — لا نہ سکے گا فرنگ میری نواؤں کی تاب

اسی بند کے آخری اشعار میں وہ اپنا نظریہ حیات بھی پیش کرتے ہیں:

جس میں نہ ہو انقلاب موت ہے وہ زندگی — روحِ اُمم کی حیات کشمکشِ انقلاب
صورت شمشیر ہے دستِ قضا میں وہ قوم — کرتی ہے جو ہر زماں اپنے عمل کا حساب
نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر — نغمہ ہے سودائے خام خونِ جگر کے بغیر ۵۶

۳۔ قید خانہ میں معتمد کی فریاد

اشبیلیہ کے بادشاہ اور عربی زبان کے شاعر المعتمد بن عباد کا ذکر شوقی کے نونیہ قصیدہ ''اندلُسیۃ'' پر لکھتے وقت اسی باب کے شروع میں ہو چکا ہے۔ ۵۷

قید خانہ میں معتمد نے جو شاعری کی ہے وہ ہندوستان کے آخری مغل تاجدار اور اردو زبان کے شاعر بہادر شاہ ظفر کی اردو شاعری سے اس لحاظ سے بڑی مماثلت رکھتی ہے کہ یہ دونوں بادشاہ تھے۔ پھر قیدی بنے اور قید خانوں میں ہی اپنی جانیں جان آفریں کے حوالے کر دیں۔ دونوں کی شاعری ذاتی احساس کی کسک میں بے مثال ہے۔ اقبال نے ''قید خانہ میں معتمد کی فریاد'' کے عنوان سے ان کے بعض ایسے ہی اشعار کی اردو میں ترجمانی کی ہے:

اک فغانِ بے شرر سینے میں باقی رہ گئی — سوز بھی رخصت ہوا جاتی رہی تاثیر بھی
مردِ حُر زنداں میں ہے بے نیزہ و شمشیر آج — میں پشیماں ہوں پشیماں ہے مری تدبیر بھی
خود بخود زنجیر کی جانب کھنچا جاتا ہے دل — تھی اسی فولاد سے شائد مری شمشیر بھی
جو مری تیغ دو دم تھی، اب مری زنجیر ہے — شوخ و بے پروا ہے کتنا خالقِ تقدیر بھی ۵۸

۴۔ عبدالرحمٰن اوّل کا بویا ہوا کھجور کا درخت

سرزمینِ اندلس میں

عبدالرحمٰن الداخل جب سرزمینِ مشرق (شام) سے اپنی جان بچا کر مغرب (اندلس) چلے

آئے اور یہاں ایک مضبوط حکومت قائم کی۔ مگر اس کامیابی کے باوجود اسے اپنے اعزہ واقربا رہ رہ کر یاد آتے تھے اور سرزمینِ شام کی یاد بھی ستاتی تھی۔ خود ہی کہا ہے:

إنّ جسمی کما تراہ بأرض   وفؤادی و مالکیہ بأرض ۵۹

(بے شک میرا جسم، جیسا کہ تم دیکھتے ہو ایک سرزمین میں ہے مگر میرا دل اور اس کے مالک ایک اور سرزمین میں ہیں۔)

ایک روز اس کی نظر کھجور کے اس درخت پر پڑی جو اسی نے مدینۃ الزہراء میں بویا تھا۔ کھجور کا یہ درخت سرزمین نخلستان سے بہت دور اندلس میں الگ تھلگ اور تنہا تھا۔ اس نے عبدالرحمٰن کے آتشِ شوق اور دردِ محبت کو برانگیختہ کیا تو اس نے دل ہی دل میں کہا کہ اندلس میں یہ درخت بھی میری طرح اجنبی ہے جو مشرق سے یہاں لایا گیا ہے۔ اسی ہجومِ شوق اور عالمِ بے قراری میں عبدالرحمٰن نے اس درخت کے متعلق جو شعر کہے وہ درج ذیل ہیں:

تبدّت لنا وسط الرصافة نخلة   تناءت بأرض الغرب عن وطن النخل

فقلت شبیهی فی التغریب والنوی   وطول التنائی عن بنیّ وعن أهلی

نشأتِ بأرض أنت فیها غریبة   فمثلك فی الإقصاء المنتأی مثلی

سقتك غوادی المزن فی المتأی الذی   یسح و یستمری السماکین بالوبل ۶۰

ترجمہ:

۱۔ شہر کے سبزہ زار کے درمیان کھجور کا ایک درخت میرے سامنے عیاں ہو گیا جو نخلستان سے بہت دور سرزمین مغرب (اندلس) میں تھا۔

۲۔ میں نے دل ہی دل میں کہا، یہ تو غریب الوطنی، دوری اور اپنے اہل وعیال سے لمبی جدائی میں میرے جیسا ہے۔

۳۔ (میں نے اس سے کہا) تو نے ایک ایسی سرزمین میں پرورش پائی ہے جہاں تو اجنبی ہے۔ اسلئے دوری اور جدائی میں تیری مثال میری جیسی ہے۔

۴۔ اس فرقت اور مجبوری میں ایسے بارش برسانے والے بادل تجھے سیراب کریں جو لگاتار برستے ہیں اور سماکین * سے بڑی بڑی بوندوں والی بارش لے آتے ہیں۔

(* دو روشن ستارے۔ ایک کو السماک الرامح اور دوسرے کو السماک الأعزل کہتے ہیں۔)

اس طرح عبدالرحمٰن الداخل ان اشعار میں اگرچہ وصف کے ایک تقلیدی موضوع کی بات کرتے ہیں مگر اس میں ترکیز عاطفی کی طرف اس قدر میلان ہے کہ اس کے ماسوا سب کچھ مخفی رہ جاتا ہے۔ کیونکہ وہ کھجور کے درخت کے لون وثمر اور طول کی بات نہیں کرتے ہیں، نہ اسے کسی لمبے بالوں والے سرکش کا نام دیتے ہیں اور نہ ہی اسے کسی دبلے پتلے، خمیدہ کمر شیخِ فانی سے تشبیہ دیتے ہیں۔ بلکہ وہ اپنے اور اس کے باہمی علائق کا ذکر کرتے ہوئے کھجور کے اس درخت کو ایک زندہ انسان کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں۔ اپنے اور اس کے درمیان بعض وجدانی مشارکتوں کا ذکر کرتے ہوئے اس سے مخاطب ہوتے ہیں، اس سے سرگوشیاں کرتے ہیں اور آخر میں اس کے لئے دعائیں دیتے ہیں کہ لگاتار بارش برسانے والے بادل بڑی بڑی بوندوں والی برسات سے اسے سیراب کریں۔

اقبال نے ''عبدالرحمٰن اوّل کا بویا ہوا کھجور کا پہلا درخت سرزمینِ اندلس میں'' کے عنوان سے جو نظم لکھی ہے، وہ ان ہی اشعار کا آزاد ترجمہ ہے۔ اقبال کی یہ اردو نظم دو حصوں پر مشتمل ہے اور ہر حصے کے پانچ پانچ اشعار ہیں۔ پہلے حصے کے پانچ اشعار، عبدالرحمٰن اوّل (الداخل) کے چار عربی اشعار کا آزاد منظوم ترجمہ ہے:

میری آنکھوں کا نور ہے تو — میرے دل کا سُرور ہے تو
اپنی وادی سے دور ہوں میں — میرے لئے نخلِ طور ہے تو
مغرب کی ہوا نے تجھ کو پالا — صحرائے عرب کی حُور ہے تو
پردیس میں ناصبور ہوں میں — پردیس میں ناصبور ہے تو

غربت کی ہوا میں بارور ہو
ساقی تیرا نمِ سحر ہو [61]

دوسرے حصے میں اقبال اپنے مخصوص حکیمانہ انداز میں اپنا پیام سناتے ہیں:

عالم کا عجیب ہے نظارہ — دامانِ نگہ ہے پارہ پارہ
ہمّت کو شناوری مبارک — پیدا نہیں بحر کا کنارہ
ہے سوزِ دروں سے زندگانی — اٹھتا نہیں خاک سے شرارہ
صبحِ غربت میں اور چمکا — ٹوٹا ہوا شام کا ستارہ

مومن کے جہاں کی حد نہیں ہے
مومن کا مقام ہر کہیں ہے ۶۲

ڈاکٹر یوسف حسین خان اس نظم کے متعلق لکھتے ہیں:

''بال جبریل میں عبدالرحمٰن اوّل کے سرزمین اندلس میں پہلا کھجور کا درخت بونے پر جو نظم ہے وہ اقبال کے آرٹ کا نہایت اعلیٰ نمونہ پیش کرتی ہے۔ ایک کھجور کے درخت میں شاعر تاریخ و روایات کے آب و رنگ سے کمال بنی کی تصویر دیکھتا ہے''۔ ۶۳

۵۔ ہسپانیہ

یہ نظم شاعر کے ان خلوص اور پر درد جذبات کی آئینہ دار ہے۔ جو اندلس کو الوداع کہتے ہوئے ان کے دریائے دل میں موجزن ہوئے تھے۔ ان اشعار میں اقبال نے اپنا جگر پرو کے رکھ دیا ہے۔ چنانچہ امت مسلمہ کے فردوسِ گم شدہ۔ اندلس۔ کو ہسپانیہ کے نام سے مخاطب کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

ہسپانیہ تو خونِ مسلماں کا امیں ہے!
مانندِ حرم پاک ہے تو میری نظر میں
پوشیدہ تری خاک میں سجدوں کے نشاں ہیں
خاموش اذانیں ہیں تری بادِ سحر میں
پھر تیرے حسینوں کو ضرورت ہے حنا کی
باقی ہے ابھی رنگ مرے خونِ جگر میں

کیونکر خس و خاشاک سے دب جائے مسلماں
مانا وہ تب و تاب نہیں اس کے شرر میں ۶۴

طارق کی دُعا
(اندلس کے میدان جنگ میں)

آبنائے طارق کو پار کرنے کے بعد طارق بن زیاد کے سرزمین اندلس میں فروکش ہونے اور اپنے سفینوں کو نذرِ آتش کرنے پھر غازیانِ دینِ مبین کے سامنے ان کی یادگار تاریخی تقریر کا ذکرِ جمیل اسی باب کے شروع میں ہو چکا ہے۔

جب طارق بن زیاد حسن تدبیر کے ساتھ اپنے لشکر کی صف بندی کر رہا تھا تو اس نے دیکھا کہ اسلامی فوج عددی طاقت، جنگی ساز وسامان اور وسائل کے لحاظ سے دشمن کی فوج سے بدرجہا کمتر تھی۔ یہ اس کے لئے بہت ہی کٹھن مرحلہ تھا۔ سیّد ابوالحسن علی ندویؒ رقم طراز ہیں:

"اس موقع پر مسلمان کمانڈر نے اپنے رب سے دعا کی اور اس کی مدد کا طالب ہوا، مسلمان قائد اس وقت رسول اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کر رہا تھا، جنہوں نے پہلی اسلامی فوج کی قیادت کی تھی اور بدر کے میدان میں صف آرائی کے بعد خلوتِ عریش میں جا کر اور سجدے میں گر کر اپنے خدا سے رو رو کر عرض کیا، "اللّٰھم ان تھلك ھذہ العصابۃُ الیوم لن تعبد" (اے خدا اگر یہ جماعت آج ہلاک ہو گئی تو پھر دنیا میں تیری عبادت نہ ہو سکے گی۔)

چنانچہ طارق نے اپنے پیغمبرؐ اور اپنے سردار کی تقلید کرتے ہوئے ایسی دعا مانگی جسے عام طور پر قائد اور فاتح نہیں مانگا کرتے اور نہ کسی کو اس کا خیال ہی آتا ہے۔ اقبال نے اس عروسِ جمیل کو لباسِ حریر پہنا کر اور دل آویز بنایا"۔ [65]

اس کا نام "طارق کی دُعا" رکھا۔ اس نظم کے دو بند ہیں اور ہر بند پانچ اشعار پر مشتمل ہے۔

پہلے بند میں رب جلیل کی بارگاہ میں خواستگاری کرتے ہوئے، اس کی راہ میں جہاد کرنے والوں کے اوصافِ حمیدہ بھی اجاگر ہو گئے ہیں۔ جہاد کی مقصدیت اور غرض وغایت بھی واضح ہو گئی ہے۔ طارق نے اپنی دعا میں کہا کہ۔ اے اللہ تیری راہ میں جہاد کرنے والے ستودہ صفات بندے صرف تیری رضا حاصل کرنے کے لئے نکلے ہیں۔ تو نے ہی انہیں یہ اوصاف حمیدہ عنایت کیے ہیں۔ یہ مال غنیمت اور حوسِ ملک گیری کے لئے نہیں نکلے ہیں بلکہ

تمہارے ہی دین کی سربلندی ان کی زندگی کا مقصد ہے۔ اس راہ میں اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کرنا یا شہادت حاصل کرنا ان کا مطلوب و مقصود ہے۔ خیاباں میں لالہ و گل ان ہی پاک نفوس کے لئے دیدہ و دل فرشِ راہ کئے ہوئے ہیں:

یہ غازی یہ تیرے پر اسرار بندے — جنہیں تو نے بخشا ہے ذوقِ خدائی
دو نیم ان کی ٹھوکر سے صحرا و دریا — سمٹ کر پہاڑ ان کی ہیبت سے رائی
دو عالم سے بیگانہ کرتی ہے دل کو — عجب چیز ہے لذتِ آشنائی
شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مؤمن — نہ مالِ غنیمت نہ کشور کشائی
خیاباں میں ہے منتظر لالہ کب سے
قبا چاہیے اس کو خونِ عرب سے [٦٦]

دوسرے بند کے پانچ شعر بھی پہلے بند کے ساتھ معنوی تسلسل رکھتے ہیں۔ بارگاہ الٰہی میں التماس کرتے ہیں کہ اے اللہ۔ تو نے ہی بکھرے ہوئے اور منتشر صحرا نشینوں کو دین و ایمان کی دولت سے نواز کر یکجا کیا اور ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار بنا دیا۔ ان کو غفلت کی نیند سے بیدار کیا اور اذانِ سحر کی بدولت انہیں ایک صبحِ نو کی بشارت دی۔ اس سے ان کی زندگی کی کایا پلٹ گئی۔ انہوں نے ساری دنیا کو "من الظلمٰت الی النور" کا سبق پڑھایا۔ اے اللہ یہ مجاہد موت کو ہلاکت نہیں سمجھتے ہیں۔ اے اللہ ان مجاہدین کے دلوں میں وہ ایمانی حرارت پیدا کر دے جس کا ظہور حضرت نوحؑ کی دُعا میں ہوا تھا جو انہوں نے کافروں سے دل برداشتہ ہو کر تیری بارگاہ میں مانگی تھی، (رَبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْاَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا)

اے اللہ ان مجاہدین کے عزائم کو بیدار کر دے اور ان کی نگاہوں کو تلوار بنا دے تا کہ یہ ان کافروں کے لشکرِ جرار کو شکست فاش دے سکیں۔

کیا تو نے صحرا نشینوں کو یکتا! — خبر میں، نظر میں، اذانِ سحر میں!
طلب جس کی صدیوں سے تھی زندگی کو — وہ سوز اس نے پایا انھیں کے جگر میں
کشادِ درِ دل سمجھتے ہیں اس کو — ہلاکت نہیں موت ان کی نظر میں
دلِ مردِ مؤمن کو پھر زندہ کر دے — وہ بجلی کہ تھی نعرۂ لَا تَذَرْ میں

عزائم کو سینوں میں بیدار کر دے
نگاہِ مسلماں کو تلوار کر دے ۶۷

اللہ تعالیٰ نے اس مومن ومخلص قائد کی دعا کو شرفِ قبولیت سے نوازا اور اسلامی فوج کو فتح حاصل ہوئی اور سارا اسپانیہ اسلامی اندلس بن گیا۔

مگر جب ان کے سامنے وہ نصب العین نہ رہا جو انہیں یہاں لے آیا تھا، جب ان میں طارق اور ان کے جانباز ساتھیوں کی روح باقی نہ رہی، جب وہ طوائف الملوکی اور بے راہ روی کا شکار ہو گئے تو انہیں ۸۰۶ سال کی حکومت کے بعد بے آبرو ہو کر یہاں سے کوچ کرنا پڑا۔ احمد شوقی نے آنسو بہاتے ہوئے اس صورتحال کی بہترین آئینہ داری کی ہے:

خرج القومُ في كتائب صمّ عن حفاظ، كموكبِ الدفن خُرُس
رکبوا البحارَ نعشاً و كانت تحت آبائهم هي العرشُ أمس
وإذا ما أصاب بنيان قوم وهْيُ خُلق، فإنه وهْيُ أسّ ۶۸

(نوٹ:۔ مذکورہ بالا اشعار کا اردو ترجمہ، اسی باب میں، شوقی کی اندلسیات میں ملاحظہ فرمائیں۔)

خلاصۂ کلام یہ کہ شوقی اور اقبال نے جب سرزمینِ اندلس کی اسلامی تاریخ کے آثار دیکھے تو بے حد متاثر ہوئے۔ دونوں بڑے شاعروں نے ان آثار سے سرگوشیاں کیں۔ تاریخی آثار نے انہیں اپنی ساری روداد سنا کر ان کے نہاں خانوں میں آگ لگا دی۔ ان کے قلق واضطراب اور حسرتوں کو اسی طرح اجاگر کیا جس طرح کہ تاریخ مندمل زخموں کو کرید کر ہرا کر دیتی ہے۔ اور غم کے مدفون خزانوں کو ہویدا کرتی ہے۔ یہی درد و کسک، یہی سوز و گداز اور یہی فکر و جذبہ ان قصائد کی جان ہے جو شوقی اور اقبال کی اندلسیات پر مشتمل ہیں۔ دونوں عبقری شاعروں کی اندلسیات میں موضوع، معنی اور آہنگ کے لحاظ سے بڑی حد تک مماثلت پائی جاتی ہے۔

اندلسیات میں شوقی کا زیادہ مشہور قصیدہ ''الرِّحْلَةُ إِلَى الْأَنْدَلُس'' ہے جو ایک سو دس اشعار پر مشتمل ہے۔ اس کا مطلع گردشِ دوراں سے متعلق ہے:

اختلاف النّهارِ و الليلِ يُنسي
اذكرا ليَ الصِّبا، وأيامَ أُنسي

اسی طرح اندلسیات میں اقبال کی نظم ''مسجد قرطبہ'' اردو ادب کی ایک بے مثال نظ
ہے۔ اس کا مطلع بھی گردشِ لیل و نہار ہی سے متعلق ہے:

سلسلۂ روز و شب نقش گرِ حادثات
سلسلۂ روز و شب، اصلِ حیات و ممات

''الرّحلۃ إلی الأندلس'' میں مسجد قرطبہ سے متعلق بارہ اشعار ہیں ان میں سے پہلا شعر یہ ہے:

و رقیق من البیوت عتیق
جاوز الألف غیر مذموم حرس

اقبال اسی نظم میں ایک دل نشین تمہید کے بعد مسجد قرطبہ کو یوں مخاطب کرتے ہیں:

اے حرمِ قرطبہ! عشق سے تیرا وجود
عشق سراپا دوام جس میں نہیں رفت و بود

جہاں شوقی مسجد قرطبہ کو ''مِن البُیُوتِ عَتِیق'' کہتے ہیں وہاں اقبال اس مسجد کو ''اے حرم قرطبہ'' کہہ کر مخاطب کرتے ہیں۔ یہ بات قابل غور ہے کہ خانۂ کعبہ کا ایک نام ''البیتُ العتیق'' بھی ہے۔ پھر ''جاوز الألف غیر مذموم حرس'' اور ''عشق سراپا دوام جس میں نہیں رفت و بود'' میں کس قدر معنوی مماثلت ہے؟ اس لئے کہ (اقبال کے الفاظ میں) اس نقش میں رنگِ ثباتِ دوام ہوتا ہے جس کو کسی مردِ خدا نے تمام کیا ہو یا شوقی کے الفاظ میں ''صَقرُ قریش'' نے تمام کیا ہو۔

۲۔ دونوں شاعروں نے معتمد بن عباد کو اندلسیات میں اپنا موضوع بنایا ہے۔ معتمد، بادشاہ اور شاعر ہونے کے علاوہ حرماں نصیب بھی تھا۔ شوقی کا معروف نونیہ قصیدہ۔ أندلسیۃ۔ اسی تلمیح سے شروع ہوتا ہے:

یا نائحَ الطَّلحِ أشباهُ عوادینا
نشجی لوادیكَ، أم نأسی لِوادینا؟

پھر شوقی نے معتمد بن عباد کے المیہ کو ''امیرۃ الاندلس'' کے عنوان سے ایک نثری ڈرامہ کی صورت میں پیش کیا ہے۔

اقبال نے اس بادشاہ کے رنج و غم اور حزن و ملال کو ایک نظم ''قید خانہ میں معتمد کی

فریاد" میں بیان کیا ہے۔اس کا مطلع ہے

اک فغان بے شرر سینے مس باقی رہ گئی
سوز بھی رخصت ہوا جاتی رہی تاثیر بھی

۳۔اسلامی اندلس کی تاریخ میں عبدالرحمٰن الداخل ایک ممتاز مقام رکھتے ہیں۔شوقی اوراقبال دونوں ان سے متاثر ہیں۔شوقی نے "صَقرُ قُرَیْشِ (عبدالرحمٰن الداخل)" کے عنوان سے ان پرایک طویل قصیدہ لکھا ہے جوایک سو بتیس (۱۳۲) اشعار پر مشتمل ہے۔یہ قصیدہ اندلسی موشح کے طرز پر لکھا گیا ہے:

مَنْ لِنِضْوٍ تَتَنَزَّى أَلَما   بَرَّحَ الشوقُ بهِ في الغَلَسِ

اقبال نے "عبدالرحمٰن اوّل کا بویا ہُوا کھجور کا پہلا درخت سرزمین اندلس میں" کے عنوان سے ایک نظم لکھی ہے۔اس نظم کے دو بند ہیں۔ پہلے بند میں عبدالرحمٰن ہی کے عربی اشعار کا آزاد ترجمہ ہے۔اس کا پہلا شعر درج ذیل ہے:

میری آنکھوں کا نور ہے تو   میرے دل کا سرور ہے تو

دوسرے بند میں علاّمہ محمد اقبال نے وہ باتیں ارشاد فرمائی ہیں جوان کی شاعری کا طرّہ امتیاز ہے۔مثلاً

مومن کے جہاں کی حد نہیں ہے   مومن کا مقام ہر کہیں ہے

۴۔دونوں شاعروں نے اندلس سے واپسی کے موقع پر بڑی دل گداز نظمیں لکھی ہیں۔شوقی نے "بعدالمنفی" کے عنوان سے ساٹھ اشعار پر مشتمل قصیدے میں اندلس کوالوداع کہا:

وداعاً أرض أندلسَ، وهذا   ثنائي إن رضيت به ثوابا

اقبال نے "ہسپانیہ" کے عنوان سے سات اشعار پر مشتمل نظم میں سرزمین اندلس کو خیر باد کہا۔اس نظم کا مطلع یہ ہے:

ہسپانیہ تو خونِ مسلماں کا امیں ہے
مانندِ حرم پاک ہے تو میری نظر میں

شوقی نے "الرّحلة إلى الأندلس" میں شہر قرطبہ کو "قُدُساً في البلاد" کہا جبکہ اقبال نے سارے اندلس کو اس نظم میں خونِ "مسلماں کا امیں" اور "مانندِ حرم پاک" کہا۔

۵۔ فاتح اندلس طارق بن زیاد کو دونوں شاعروں نے اپنی اندلسیات میں ایک مثالی رمز / علامت (Symbol) کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔

شوقی ''الأندلس الجدیدة'' میں ان کے بارے میں لکھتے ہوئے مسلمانوں کو یوں مخاطب کرتے ہیں:

وقف الزمان بکم کمَوقف "طارق"
الیاس خلف والرّجاءُ أمام
الصبرُ والإقدامُ فیه إذا هما
قتلا فأقتل منهما الإحجام

اقبال نے طارق بن زیاد کے اندلس وارد ہونے کے بعد اپنے سفینوں کو نذرِ آتش کرنے کا ذکر جمیل پیامِ مشرق میں کیا ہے۔ پھر ''بال جبریل'' میں اپنی اندلسیات میں ''طارق کی دعا (اندلس کے میدان جنگ میں)'' کے عنوان سے ایک نظم لکھی ہے جس کا مطلع ہے:

یہ غازی یہ تیرے پر اسرار بندے
جنہیں تو نے بخشا ہے ذوقِ خدائی

یوں دونوں بڑے شاعروں کی اندلسیات کا دبستان گلہائے رنگ رنگ سے مزیّن ہے۔ اس میں دونوں شاعروں کے درمیان موضوعات وافکار اور درد وکسک کے لحاظ سے بڑی حد تک یک رنگی ویکسوئی پائی جاتی ہے۔

☆☆☆☆

حوالہ جات

ا۔ الدکتور أحمد هیکل، الأدب الأندلسی من الفتح إلی سقوط الخلافة، القاهرة، دار المعارف، ۱۹۹۳ء ص ۱٦-۲۱

۲۔ ایضاً ص ۱۳-۱۵

۳۔ کلیات اقبال (اردو) ص۔ ۱۳۲

۴۔ الأدب الأندلسی من الفتح إلی سقوط الخلافة، ص ۲۲-۲۵

Stanly Lane-Poole, The Muslims in Spain,New Delhi, Goodword Books, Pvt. Ltd. Nizamuddin West Market, 2006, P. 3-20.

W. Montgomery Watt, A History of Islamic Spain, – Edinburgh, University Press, 1965, P.1-8

عبد الماجد القاضی، فی رحاب الأدب واللغة، نئی دہلی، جوہری فارم، جامعہ نگر، ۲۰۱۳ء، ص ٦۸۔

۵۔ ابن خلکان احمد البرمکی، وفیات الأعیان و أنباءُ أبناءِ الزمان، بیروت، دار الکتب العلمیة، ۱۹۷۲ء، ص ۳۲۱۔

الندوی، ابو الحسن علی، مختارات، جلد ثانی، لکناؤ (الهند)، المجمع الاسلامی العلمی، ۲۰۱۱ء، ص ۴۹

The Muslims in spain, P. 18, 19.

٦۔ کلیاتِ اقبال، (فارسی)، ص ۶۲۸-۶۲۹

۷۔ الأدب الأندلسی من الفتح إلی سقوط الخلافة، ص ۲٦-۲۷۔

۸۔ ایضاً ص ۲۷-۲۹۔

تاریخ ادب عربی، ص ۴۲۴-۴۲٦

فی رحاب الأدب واللغة، ص ٦۸۔

۹۔ تاریخ ادب عربی، ۴۲۵-۴۲٦۔

مزید تفصیل کے لئے۔

A Literary History of the Arabs, p. 414-415

۱۰۔ مقالات شبلی، جلد سوم، اعظم گڈھ، مطبع معارف، ۱۹۵۵ء/ ۱۳۷۸ھ، ص ۷۴۔

مزید وضاحت کے لئے۔

Muhammad Asad, Islam at the Crossroads, Noor Publishing House, Faras Khana, Delhi, 1992, p. 88.89.

11. R. W. Southern, Western views of Islam in the Middle Ages, Cambridge.Harvard University Press, 1962, P.21.

مزید وضاحت کے لئے ملاحظہ فرمائیں:

M. Nakasteen, A History of Islamic origin of Western Education, AD 800-1350, University of Calarode Press, 1964.

12. Islam at the cross roads, P. 89

۱۳۔ شوقی شعره الإسلامی، ص ۸۸۔

ایضاً، ص ۴۹،

الإسلام فی شعر شوقی، ص ۲۔

Mounah A. Khouri, poetry and the Making of Modern Egypt, (1882-1922) Volume-1, Leiden, E. J. brill, 1971, P. 98-102

Ibid, P.66-75

۱۴۔ الشوقیات، الجزء الأل، ص ۱۳۹-۱۴۱۔

ایضاً، ص ۱۹۷۔

د-طه وادی، شعر شوقی الغنائی و المسرحی، القاهرة، دار المعارف، ۱۹۸۵ء، ص ۱۲

۱۵۔ تاریخ ادب عربی، ص ۴۰۴۔

۱۶۔ ایضاً، ص ۳۶۰

۱۷۔ الشوقيات، الجزء الثاني ص ۲۷۰-۲۷۷

۱۸۔ ایضاً، ص ۲۷۱۔

۱۹۔ ایضاً، ص ۲۷۱-۲۷۲

۲۰۔ ایضاً، ص ۲۷۴

۲۱۔ ایضاً، ص ۲۷۴-۲۷۵

۲۲۔ ایضاً، ص ۲۷۵۔

۲۳۔ ایضاً، ص ۲۷۵۔

۲۴۔ بشیر احمد ڈار، انوارِ اقبال، اقبال اکادمی لاہور، ۱۹۶۸ء ص ۱۰۳-۱۰۶۔

۲۵۔ الشوقیات، الجزء الثانی، ص ۲۷۶۔

۲۶۔ ایضاً ص ۲۷۷۔

۲۷۔ تاریخ ادب عربی، ص ۴۳۶۔

۲۸۔ ایضاً، ص ۴۳۱۔

۲۹۔ الشوقیات، الجزء الثانی، ص ۳۱۸۔

۳۰۔ ایضاً، ص ۳۲۱۔

۳۱۔ شوقی، شعرہ الإسلامی، ص ۲۰۳۔

۳۲۔ ایضاً، ص ۲۰۳،

الشوقيات، الجزء الثانی، ص ۳۷۱۔

۳۳۔ ایضاً، ص ۳۷۱

۳۴۔ ایضاً، ص ۳۷۳

۳۵۔ ایضاً، ص ۳۷۳

۳۶۔ ایضاً، ص ۳۷۶

۳۷۔ ایضاً، ص ۳۷۷

۳۸۔ شوقی، شعرة الإسلامی، ص ۲۰۱-۲۰۲۔

۳۹۔ الشوقیات، الجزء الأول، ص ۵۲۔

۴۰۔ ایضاً، ص۵۲۔

۴۱۔ الشوقیات، الجزء الأول، ص۵۲

۴۲۔ ایضاً، ص۵۳۔

۴۳۔ ایضاً، ص۵۳۔

۴۴۔ ایضاً، ص۵۵۔

۴۵۔ ایضاً، ص۱۸۵-۱۸۶۔

شوقی شعرۃ الاسلامی، ص۱۶۰-۱۶۱۔

فی رحاب الأدب و اللغة، ۷۳-۷۶

۴۶۔ الشوقیات، الجزء الأول، ص۱۸۸۔

۴۷۔ ایضاً، ص۱۹۰۔

۴۸۔ ایضاً، ص۱۹۱۔

۴۹۔ نقوش اقبال، ص۴۰-۴۱۔

۵۰۔ فقیر سید وحید الدین، روزگار فقیر، جلد دوم، ص۴۱!

۵۱۔ کلیات اقبال، ص۳۱۴-۳۲۷۔

۵۲۔ نقوش اقبال، ص۱۴۵۔

۵۳۔ ایضاً، ص۱۵۵-۱۵۶۔

۵۴۔ ڈاکٹر یوسف حسین خان، روحِ اقبال، ص۸۸-۸۹۔

۵۵۔ نقوش اقبال، ص۱۵۰۔

۵۶۔ کلیات اقبال، (اردو) ص۳۱۵-۳۲۳۔

۵۷۔ وضاحت کے لئے ملاحظہ فرمائیں

A A. Nicholson, A literary History of the Arabs, Delhi,
lam Publishers & Distributors, 1994, P. 422.424.

تاریخ ادب عربی، ص۴۳۱۔

۵۸۔ ابن عذاری المراکشی، البیان المغرب، بیروت، مطبعة المناہل، ۱۹۵۰ء، ج۲، ص۸۹

أحمد المقرى المغربى، نفح الطيب من غصن الأندلس الرطيب، القاهرة، المطبعة الأزهرية، ۱۳۰۲ھ ج ۲، ص ۶۸۔

الأدب الأندلسى من الفتح إلى سقوط الخلافة ص ۹۰۔

۵۹۔ البيان المغرب، ج ۲، ص ۹۰۔

نفح الطيب من غصن الأندلس الرطيب، ج ۲، ص ۷۶۔

۶۰۔ کلیاتِ اقبال، (اردو) ص ۳۲۴۔

۶۱۔ ایضاً ص ۳۲۴-۳۲۵۔

۶۲۔ روحِ اقبال، ص ۷۶۔

۶۳۔ کلیاتِ اقبال، (اردو) ص ۳۲۵-۳۲۶۔

۶۴۔ نقوش اقبال، ص ۱۸۰

۶۵۔ کلیات اقبال، (اردو) ص ۳۲۶۔

۶۶۔ ایضاً ص، ۳۲۷۔

مزید تفصیل کے لئے نقوش اقبال، ص ۱۷۹-۱۸۲۔

۶۷۔ الشوقيات، الجزء الثانى، ص ۲۷۶۔

☆☆☆☆

باب نہم

خلاصۂ بحث

خلاصۂ بحث

اس وقت امت مسلمہ تاریخ کے بہت ہی نازک دوراہے پر کھڑی ہے۔ پھر ستم بالائے ستم یہ کہ اندرونی خلفشار، ذہنی بحران اور اخلاقی برائیوں نے مجموعی طور پر امت کو خود فراموشی میں مبتلا کر رکھا ہے۔ اس کے پسِ پردہ بعض سیاسی حکمت عملیاں بھی کارفرما ہو سکتی ہیں تاکہ یہ امت خود شناس اور خود اعتمادی کی دولت سے بھی محروم ہو جائے۔ اس تہذیبی تصادم کے دور (Clash of civilizations) کے دور میں جبکہ مسلم ممالک میں اسلامی تہذیب و تمدن اور ثقافت کی جڑیں بڑی بے دردی اور ہوش مندی سے کاٹی جا رہی ہیں اور پتوں کی آبیاری کی جا رہی ہے، افراد امت ہیں کہ ٹس سے مس نہیں ہوتے بلکہ ''اصحٰب کہف'' کی طرح گہری نیند میں ہیں۔ انہیں شعور ہی نہیں کہ کب اٹھائے جائیں گے۔

وَكَمْ رَأَيْنَا مِنْ فُرُوعٍ طَوِيلَةٍ

تَمُوتُنَّ إِذَا لَمْ تَحْيِهِنَّ الأُصُولُ

(ہم نے کتنی ہی بار آور شاخوں کو مرجھاتے ہوئے دیکھا ہے جبکہ ان کی جڑیں انہیں رزق پہنچانا بند کر دیتی ہیں۔)

اس تہذیبی جارحیت کے روح فرسا دور میں بھی امت کی دینی تنظیموں میں باہم رسہ کشی پائی جاتی ہے۔ وہ باہم دست و گریباں ہیں۔ سیاسی قائدین ایک دوسرے کے خلاف برسرِ پیکار ہیں۔ سیاست دانوں کا یہ ٹولہ خود سری، خود نمائی اور مفاد پرستی میں مبتلا ہے۔ اس لئے ان کی دولت میں بدمستی ہے، ان کی دوستی میں بے وفائی ہے، ان کی عدالت میں ناانصافی ہے اور ان کی حکومت میں ظلم ہے۔ ان کے ہاتھوں اسلام بھی مظلوم ہے اور مسلمان بھی مظلوم ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ مسلم ممالک میں کہیں ملوکیت ہے تو کہیں آمریت۔ اگر کہیں جمہوریت ہے تو وہ بھی لادین اور خلافت یا نظام اسلامی کے نام لیوا معتوب و محبوس ہیں۔ مختصر یہ کہ جو نظامہائے حیات موجودہ مسلم ممالک میں اپنائے جاتے ہیں یا رائج ہیں وہ اس دینِ مبین کی ضد ہیں جس کا نام اسلام ہے۔ اسی لئے ایک اللہ، ایک قرآن، ایک حرمِ پاک، ایک

دین اور ایک رسول اکرم ﷺ پر ایمان رکھنے والی اس امت کا شیرازہ بکھرا ہوا ہے۔ دنیا کے نقشے پر اس کے بچپن ممالک اور ان بچپن ممالک کی او۔ آئی۔ سی (الرابطۃ العالم الاسلامی) کا کوئی دم خم نہیں۔ بلکہ اقوام عالم کی نظروں میں یہ ایک لایعنی اور مہمل سا نام رہ گیا ہے۔ اہل طاغوت نے ان تمام کمزوریوں کا بھرپور فائدہ اٹھایا ہے اور وہ کسی نہ کسی طرح اس امت پر اور امت کے ان تمام ممالک پر مسلط ہیں۔

امت مسلمہ اپنی تاریخ میں کئی مرتبہ زبردست آزمائشوں سے دوچار ہوئی ہے لیکن ہر مرتبہ امت نے غیر معمولی کامیابیاں حاصل کی ہیں اور وہ اپنے حریف کے مقابلے میں سُرخرو ہوئی ہے۔ اختصار کے ساتھ ہم صرف ایک مثال پیش کرتے ہیں کہ جب منگولوں نے عباسی خلافت کی اینٹ سے اینٹ بجادی اور سارے بغداد کو تباہ و برباد کردیا۔ لیکن انہوں نے اپنی تمامتر فوجی کامیابیوں کے باوجود آخر اسلام کے ازلی وابدی اور آفاقی پیام کے سامنے سرِ تسلیم خم کیا اور مسلمان ہو گئے۔ پھر ان کی بڑی بڑی مملکتوں نے اسلام کی ہی خدمت کی۔

ہے عیاں یورشِ تاتار کے افسانے سے
پاسباں مل گئے کعبے صنم خانے سے

اصل بات یہ ہے کہ حق، حق ہے چاہے کوئی اسے مانے یا نہ مانے، حق، حق ہے چاہے ساری دنیا اس کی مخالفت کرے، پھر بھی وہ حق ہے۔ اسے تسلیم کرنے کے سوا کوئی چارۂ کار بھی نہیں ہوتا۔ اسلئے کہ وہ حق ہے اور اسے طوعاً یا کرھاً تسلیم کرنا ہی پڑتا ہے۔ چنگیز و ہلاکو خان کے تاتاری حملہ آوروں کے پاس کیا کچھ نہ تھا؟ مگر وہ اس ایمانی اور روحانی دولت سے عاری تھے جو قرآن اور صاحبِ قرآن ﷺ نے مسلمانوں کو عنایت کی تھی۔ جب تاتاریوں کو یہ دولت مل گئی تو وہ اسی کے ہو گئے۔ وہ وحشی اور غارت گر تھے۔ تہذیب وتمدّن سے نابلد تھے۔ جب انہوں نے اس تہذیب وتمدّن اور ثقافت کو دیکھا جو اسلام کی بدولت مسلم معاشرے میں پروان چڑھی تھی تو ان کی آنکھیں خیرہ ہو کر رہ گئیں اور انہوں نے اسے گلے سے لگایا۔ اس طرح سے ان فاتح تاتاریوں نے اسلام کے سامنے اپنے ہتھیار ڈال دئے اور وہ فاتح ہو کر مفتوح ہو گئے۔

اسلام پہلے کی طرح ہر دور میں اس طرح کے اعجاز اور کرشمے دکھانے کی استعداد،

قت اور قابلیت رکھتا ہے۔ اس دور میں زمانہ خاص طور پر اسی کے اعجاز کا منتظر ہے۔ شوقی ر اقبال ہمیں بڑے ہی معتدل اور متین لہجے میں یہی بات کہتے ہیں۔ دونوں کی دعوت ابل ہے اور لائق عمل بھی۔

دونوں شاعروں نے اہلِ مغرب کی شاطری، خلافت کے زوال اور مسلم ممالک کے انتشار کا عینی مشاہدہ کیا، ان میں قومیت وطنیت اور اقلیمیت سے پیدا شدہ رُسوا کن اور بیانک نتائج بھی دیکھے، اس بات کو بھی بخوبی بھانپ لیا کہ اہلِ مغرب خود تو اپنے لئے کسی رکز کی تلاش میں ہیں امت مسلمہ کا مضبوط و مستحکم مرکز ان کے دلوں میں کانٹے کی طرح ھٹکتا ہے اور وہ اس کے لئے درپے آزار ہیں، وہ خود اپنے استعماری مفادات کے لئے باہم تحد ہیں لیکن امت مسلمہ کے اتحاد اور بھائی چارہ کو تاراج کر رہے ہیں۔ دونوں شاعروں نے ن حالات کا بھی بغور مشاہدہ کیا کہ کس طرح سادہ لوح مسلمان اہلِ مغرب کے جال میں ھنس گئے اور کس طرح عرب و عجم کے میر جعفر و میر صادق جیسے ننگِ ملت، ننگِ دین اور ننگِ ن مفاد پرستوں نے بہت ہی کم قیمت میں چند پھوٹی کوڑیوں کے عوض (بِثَمَنٍ بَخْسٍ راھِمَ مَعْدُوْدَة) ناموسِ دین مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم کا سودا کیا۔

ان تمام ملی امراض اور ناسوروں کا علاج ان دونوں شاعروں کو اُسی نسخۂ کیمیا میں نظر آیا س نے اس سے قبل اسی طرح کے انسانی انتشار کو دور کیا۔ عرب کے قبائلی انتشار، مدینہ کے س و خزرج کی خون آشام لڑائیاں آخر اسی سے ختم ہو گئیں اور بنی نوع انسان نے اخوت، بھائی پارہ اور یگانگت کی ایک قابل تقلید مثال قائم کی۔ آج بھی یہ سرودِ ازلی امت مسلمہ کے لئے اور الَمِ اسلام کے قائدین کے لئے آبِ حیات ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

اعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا ص وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَاءً أَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا ط وَ كُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ أَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا ط كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ○ (ال عمران:۱۰۳)

ب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوط پکڑ لو اور تفرقہ میں نہ پڑو۔ اللہ کے اس احسان کو یاد رکھو جو اس نے تم پر کیا ہے۔ تم ایک دوسرے کے دشمن تھے، اس نے تمہارے دل جوڑ دیے اور اس کے فضل و کرم سے تم بھائی بھائی بن گئے۔ تم آگ سے بھرے ہوئے ایک گڑھے کے کنارے کھڑے

تھے۔ اللہ نے تم کو اس سے بچالیا۔ اس طرح اللہ اپنی نشانیاں تمہارے سامنے روشن کرتا ہے شائد کہ ان علامتوں سے تمہیں اپنی فلاح کا سیدھا راستہ نظر آجائے۔

اسلئے امت مسلمہ کو مغرب کی حاشیہ برداری اور کشکول گدائی کو چھوڑ کر اللہ کے دین کو مضبوطی سے تھامنا ہوگا۔ یہی وہ رشتہ ہے جو ان کا تعلق اللہ سے پیدا کرے گا اور ان کے دلوں کو باہم جوڑے گا۔ اس عظیم تر مقصد کے لئے قرآن کریم اور رسول اکرم ﷺ لازم وملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ قرآن کریم کتاب زندگی ہے اور رسول اکرم ﷺ کی سیادت وقیادت ان ہی کی رہبری ورہنمائی میں اس کتاب زندگی کی اتباع کرنی ہے۔ فرقہ بندی کو چھوڑ کر باہم متحد ہوکر، ملوکیت، آمریت، اشتراکیت اور لادین جمہوریت کو طلاق مغلظہ دے کر نظام خلافت کو قائم کرنا ہوگا۔ اسی کے ساتھ اپنے مرکز کو مضبوط و مستحکم بنانا ہوگا۔ یہ کوئی خواب نہیں ہے اور نہ کوئی سراب ہے بلکہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کی بشارت خود رب جلیل نے دی ہے۔

وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ۝ (ال عمران: ۱۳۹)

لیکن اس اعلیٰ تر اور ارفع تر نصب العین کو حاصل کرنے کے لئے، امت کے جلیل القدر علماء، با کردار اہلِ علم اور دین دار سیاست دانوں کو مل جل کر راہ ہموار کرنے ہوگی اور اہلِ ایمان کو اس عظیم کام کے لئے تیار کرنا ہوگا۔ یہ اس دور کا مجتہدانہ کارنامہ ہوگا۔ ان شاء اللہ ایسا ضرور ہو کر رہے گا۔ اسلئے کہ ساری انسانیت اسی انقلاب کے لئے ماہیِ بے آب کی طرح تڑپ رہی ہے۔ جب وہ اسے پائیں گے تو گویا اپنی ہی متاعِ گم شدہ کو پائیں گے جس کے وہ متلاشی ہیں اور یہ اس دور کو عظیم ترین کارنامہ ہوگا۔

امیر الشعرا احمد شوقی اسی لئے کہتے ہیں کہ زمانہ نے تمہیں ایک ایسے موڑ پر لا کھڑا کیا ہے جس طرح فاتحِ اندلس طارق بن زیاد کو لا کھڑا کیا تھا کہ پیچھے نا امیدی تھی، غرقِ دریا ہونا تھا لیکن وہ صبر واستقامت سے کام لے کر آگے بڑھے تو ساری رُکاوٹیں دور ہوگئیں بلکہ کافور ہو گئیں اور سارا اندلس ان کے زیر نگیں تھا۔ امت مسلمہ کو بھی صبر واستقامت سے کام لے کر

آگے بڑھنا ہوگا تو تمام رُکاوٹیں دور ہو سکتی ہیں:

وقف الزمانُ بِکم کموقفِ "طارق"
الیأسُ خلفَ، وَالرّجاء أمام
الصبرُ و الإقدام فیہ إذا هما
قتلا فأقتلُ منهما الأحجام

علامہ محمد اقبال بھی قرطبہ کے مشہور دریا، وادی الکبیر کے کنارے اسی زمانے کا خواب دیکھ رہے ہیں جس کی صبحِ جاں نوازان کی نگاہوں کے سامنے بے حجاب ہے۔

آبِ روانِ کبیر! تیرے کنارے کوئی
دیکھ رہا ہے کسی اور زمانے کا خواب
عالمِ نَو ہے ابھی پردۂ تقدیر میں
میری نگاہوں میں ہے اس کی سحر بے حجاب

☆☆☆☆

کتابیات

عربی مراجع ومصادر

۱۔ القرآن الکریم

۲۔ أبوحاقة، الدکتورأحمد، الإلتزام في الشعر العربی، بیروت، دارالعلم للملایین، ۱۹۷۹ء

۳۔ ألفاسي، علال، الحرکات الإستقلالیة في المغرب العربي، القاهرة، مطبعة الرسالة، ۱۹۴۸ء

۴۔ أمین، أستاذأحمد، زعماءالإصلاح في العصر الحدیث، القاهرة، مکتبة النهضة المصریة، ۱۹۴۸ء

۵۔ الباجوري ، الشیخ ابراهیم، شرح البردة للإمام البوصیریؒ، القاهرة، میدان الأوبرا، ۱۲۹۶ھ

۶۔ البارودي، محمود سامي، کشف الغمة في مدح سیّد الأمّة، القاهرة، مبطعة الجریدة، ۱۳۲۷ھ

۷۔ البرمکي، ابن خلکان أحمد، وفیات الأعیان و أنباء أبناء الزمان، بیروت، دارالکتب العلمة، ۱۹۷۲ء

۸۔ البوصیريؒ، محمد بن سعید بن حماد، قصیدة البردة، القاهرة، مکتبة الآداب، ۱۲۷۷ھ

۹۔ الجندی، أنور، المعارك الأدبیة في مصرمنذ ۱۴-۱۹۳۹ء، القاهرة مکتبة الأنجلو المصریة، ۱۹۸۲ء۔

١٠- الحوفى ،الدكتور أحمد محمّد،الاسلام فى شعرشوقى،
القاهرة،المجلس الأعلى للشعون الاسلامية،١٩٦٢م
١١- حسين ،الدكتورمحمد محمد ،الإتجاهات الوطنية في الأدب المعاصر، بيروت، دارالنهضة العربية، ١٢٩٢ھ
١٢- الدسوقي، عمر، في الأدب الحديث، القاهرة، دارالفكر العربي،١٩٧٠م
١٣- الدسوقي، عمر،فى نشأة النشر الحديث وتطوّره،، القاهرة، دارالفكر العربي ١٩٧٠ء
١٤- الرافعي، مصطفىٰ صادق،إعجاز القرآن، بيروت، دارالكتاب العربي، ٢٠٠٥م
١٥- زين، نوارالدين، الصراع الدولي في الشرق الأوسط و ولادة دَوْلَتَىْ سوريا و لبنان، بيروت، دارالنهار،١٩٧١م
١٦- الشايب، أحمد، أصول النقد الأدبي ، القاهرة، مكتبة النهضة المصرية، ١٩٨٣م
١٧- شوقي، أحمد، (أمير الشعراء) الشوقيات، مصر، مكتبة التجارية الكبرىٰ ١٩٨٣م
١٨- شوقي، أحمد، (أمير الشعراء) الشوقيات،
صنبطه، د-يوسف الشيخ محمد البقاع، بيروت، دارالكتاب العربى ،٢٠٠٧م
١٩- شوقي، أحمد، أسواق الذهب، بيروت، دارالكتاب العربي، ١٩٧٠م
٢٠- شوقي، حسين، أبي شوقى ، القاهرة، مكتبة النهضة المصرية،١٩٤٧ء

٢١ـ صفوت، محمد مصطفى، الاحتلال الإنجليزي لمصر و موقف دول الكبرى إذاء ه، القاهرة، دارالفكر العربي، ١٩٥٢م
٢٢ ضيف، الدكتور، شوقي، شوقي شاعر العصر الحديث، القاهرة، دارالمعارف، ١٩٨٦م
٢٣ـ ضيف، الدكتور شوقي، فصول في الشعر و نقده، القاهرة، دارالمعارف، ١٩٧٧م۔
٢٤ـ ضيف ، الدكتور شوقي، تاريخ الأدب العربي الجزء ٦، القاهرة، دارالمعارف، ١٩٧٤ء
٢٥ـ ضيف، الدكتور شوقي، الأدب العربي المعاصر في مصر، القاهرة، دارالمعارف، ١٩٩٥م
٢٦ـ عطوي، فوزي، أحمد شوقي أمير الشعراء، بيروت ، الشركة اللبنانية للكتابة، ١٩٦٩م
٢٧ـ الفراهي، الإمام عبدالحميدؒ، في ملكوت اللّٰه، سرايمير، اعظم كرة، ١٣٩١ھ/١٩٧١م۔
٢٨ـ الفكيكي، توفيق، دِفاعٌ عن شعراء، بيروت، دارالكتاب اللبناني، بلا تاريخ ـ
٢٩ـ الفقي ، دكتور محمد كامل، الأذهر و أثره في النهضة الأدبية الحديثة، الضحالة، مكتبة نهضة مصر، ١٩٦٥م
٣٠ـ فهمي ، دكتور ماهر حسن، شوقي شعره الإسلامي، القاهرة، دارالمعارف بمصر، ١٩٥٣م۔

٣١ـ القاضي، دكتور عبدالماجد، فى رحاب الأدب واللغة، نئى دهلي، جوهرى فارم، جامعه نگر، ٢٠١٣م

٣٢ـ قلعجي، قدري، محمّد عبده، بيروت، دارالعلم للملايين، ١٩٤٨م

٣٣ـ كوكن، محمّد يوسف، أعلام النثر و الشعر في العصرالعربى الحديث، مدراس، حافظ هاوس، ١٩٨٠م

٣٤ـ مبارك، زكي، الموازنة بين الشعراء، بيروت، المكتبة المعرّية، ١٩٣٦م

٣٥ـ المحاسني، الدكتور زكى، الأدب الديني، القاهرة مكتبة الأنجلو المصريّة، ١٩٧٠م

٣٦ـ المراكشى، ابن عذارى، البيان المغرب، بيروت، مطبعة الماهل، ١٩٥٠م

٣٧ـ مصرى، السيّد رشيد رضا، تاريخ الأستاذ الإمام، القاهرة، مطبعة المنار بمصر، ١٣٥٠هـ/١٩٣١م

٣٨ـ المغربي، أحمد المقرى، نفح الطيب من غصن الأندلس الرطيب، القاهرة، المطبعةالأزهريّة، ١٣٠٢هـ

٣٩ـ المنجد في اللّغة والأعلام، بيروت، دارالمشرق، ١٩٨٦م۔

٤٠ـ الندوي، أبوالحسن على، روايع اقبال، لكناؤ، (الهند) المجمع الإسلامي العلمي، ١٩٧٨م۔

٤١ـ الندوي، أبوالحسن على، ماذاخسر العالم بانحطاط المسلمين، لكناؤ (الهند) المجمع الإسلامي العلمي، ١٤١٥هـ/١٩٩٤م

۴۲۔ الندوي، أبوالحسن علي، مختارات، الجزء الثاني، لكناؤ (الهند) المجمع
الإسلامي العلمي، ۲۰۱۱م
۴۳۔ هيكل، الدكتور أحمد، الأدب الأندلسي من الفتح إلى سقوط الخلافة،
القاهرة، دارالمعارف، ۱۹۹۳م
۴۴۔ وادی، د۔طه، شعر شوقي الغنائيي والمسرحي، القاهرة، دارالمعارف،
۱۹۸۵م۔
۴۵۔ الوهاب، دكتوره سعاد عبد، إسلاميات أحمد شوقي دراسة نقدية، مصر،
مطابع أهرام الجيزة الكبرىٰ، ۱۹۸۰م

(ب) اردو کتب
۱۔ احسن، ڈاکٹر عبدالشکور، اقبال کی فارسی شاعر کا تنقیدی جائزہ، لاہور، اقبال اکادمی
پاکستان، طبع دوم، ۲۰۰۰ء
۲۔ ازھری، مقتدی حسن، تاریخ ادب عربی، حصہ دوم، بنارس، إدارۃ البحوث الاسلامیۃ
والدعوۃ والإفتاء، ۱۹۸۱ء
۳۔ اصلاحی، ڈاکٹر شرف الدین، ذکرِ فراہیؒ، سرائے میر، اعظم گڑھ، دائرہ حمیدیہ، ۲۰۰۱ء
۴۔ اصلاحی، عبدالرحمٰن ناصر، (مرتب) مختصر حیاتِ حمیدؒ، سرائے میر، اعظم گڑھ، دائرہ
حمیدیہ، ۱۹۷۳ء۔
۵۔ اصلاحی، مولانا صدرالدینؒ، تلخیص تفہیم القرآن، دہلی مرکزی مکتبہ اسلامی، ۱۹۷۶ء
۶۔ اقبالؔ، علامہ محمد، جاوید نامہ، لاہور، شیخ غلام علی اینڈ سنز، کشمیری بازار، طبع سوم، ۱۹۵۴ء

۷۔ اقبال، ڈاکٹر جاوید، زندہ رود، لاہور، اقبال اکادمی پاکستان، ۲۰۰۴ء

۸۔ اقبال، علامہ محمد، کلیاتِ اقبال (اردو) دہلی، مرکزی مکتبہ اسلامی، ۱۹۹۳ء

۹۔ اقبالؔ، علامہ محمدؒ، کلیات (فارسی) لاہور، شیخ غلام علی اینڈ سنز، ۱۹۹۔سرکلر روڈ، انارکلی، ۱۹۷۲ء۔

۱۰۔ اقبالیات، شمارہ ۲۲، اقبال انسٹی ٹیوٹ آف کلچر اینڈ فلاسفی، کشمیر یونیورسٹی، ۲۰۱۳ء۔

۱۱۔ چغتائی، ڈاکٹر محمد عبداللہ، اقبال کی صحبت میں، لاہور، مجلس ترقی ادب، ۱۹۷۷ء۔

۱۲۔ چشتی، پروفیسر سلیم، شرح جاوید نامہ، نئی دہلی اعتقاد پبلشنگ ہاوس، ۱۹۹۳ء۔

۱۳۔ حالیؔ، مولانا خواجہ الطاف حسینؒ، حیاتِ جاوید، دہلی انجمن ترقی اردو، ۱۹۳۹ء۔

۱۴۔ خان، ڈاکٹر غلام مصطفیٰ، اقبال اور قرآن، لاہور، ادارہ ثقافت اسلامیہ، ۱۹۷۷ء

۱۵۔ خان، یوسف حسین، روحِ اقبال، حیدرآباد، اعظم اسٹیم پریس، ۱۹۶۱ء۔

۱۶۔ دیوبندی، مولانا ذوالفقار، شرح بانَت سعاد، دیوبند، کتب خانہ رحیمیہ، ۱۹۶۷ء۔

۱۷۔ ڈار، بشیر احمد، انوارِ اقبالؔ، اقبال اکادمی لاہور، ۱۹۶۸ء

۱۸۔ زیات، استاد احمد حسن، تاریخ ادب عربی، مترجم عبدالرحمٰن طاہر سورتی، دہلی، قاری پبلی کیشنز، ۲۰۰۴ء۔

۱۹۔ شیخ اکرام، موجِ کوثر، دہلی، ادبی دنیا، ۵۱۰ مٹیا محل، ۱۹۹۱ء۔

۲۰۔ عبداللہ، ڈاکٹر سیّد، مقاماتِ اقبال، دہلی ۶، چمن بک ڈپو، اردو بازار، بلا تاریخ اشاعت۔

۲۱۔ عبدالحکیم، خلیفہ، فکرِ اقبال، علی گڈھ، ایجوکیشنل بک ہاوس، ۲۰۰۲ء۔

۲۲۔ عقیل، ڈاکٹر معین الدین، ''صحیفہ'' اقبال نمبر حصہ اوّل لاہور، مجلس ترقی ادب، جولائی
اکتوبر، ۱۹۷۷ء۔
۲۳۔ فتحپوری، ڈاکٹر فرمان، اقبال سب کے لئے، دہلی، ایجوکیشنل بک ہاوس، ۲۰۱۲ء۔
۲۴۔ فقیر، سیّد وحید الدین، روزگار فقیر، نئی دہلی، اسلامک بک فاونڈیشن، ۱۹۹۲ء
۲۵۔ فلاحی ڈاکٹر عبید اللہ فہد، احیائے دین اور ہندوستانی مسلمان، بارہمولہ، کشمیر، القلم پب
کیشنز، ۲۰۱۱ء۔
۲۶۔ قریشی، محمد عبداللہ، معاصرین اقبال کی نظر میں، لاہور، مجلسِ ترقی ادب، ۱۹۷۷ء۔
۲۷۔ مودودی، سید ابوالاعلیٰؒ، شخصیات، دہلی، ذکری انٹرنیشنل پبلشرز، ۲۰۰۶ء۔
۲۸۔ مودودی، سید ابو الاعلیٰؒ تفہیم القرآن، دہلی، مرکزی مکتبہ اسلامی، ۱۹۸۲ء۔
۲۹۔ ندوی، سید ابوالحسن علی، نقوشِ اقبال، (''روائع اقبال'' کا اردو ترجمہ از شمس تبر
خان)، لکھنو، مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، ۲۰۰۷ء۔
۳۰۔ ندوی، ابوالحسن علیؒ، مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش، لکھنو، مجلس
تحقیقات ونشریات اسلام، ۲۰۰۳ء۔
اس کتاب کا عربی نام ''الصراع بین الفکرة الإسلامیة و الفکرة الغربیة'' ہے۔
۳۱۔ ندوی، پروفیسر سید احتشام حسین، عصر حاضر کی اسلامی تحریکیں، علی گڈھ، انٹرنیشنل
پرنٹنگ پریس، ۱۹۸۸ء۔
۳۲۔ ندوی، ڈاکٹر عبدالحلیم، عربی ادب کی تاریخ، جلد دوم، نئی دہلی، قومی کونسل برائے فروغ
اردو زبان، ۲۰۰۴ء
۳۳۔ ندوی، ڈاکٹر عبداللہ عباس، عربی میں نعتیہ کلام، لکھنو، مکتبہ اسلام، ۲۰۰۵ء۔

۳۴۔ ندوی، عبدالسلام، اقبالِ کامل، اعظم گڑھ، دارالمصنفین، ۱۹۴۸ء۔

۳۵۔ ندوی، مولوی محمد اسحٰق جلیس، تاریخِ ندوۃ العلماء، لکھنو، مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، ۱۹۸۳ء۔

۳۶۔ نعمانی، علامہ شبلیؒ، سفرنامہ روم، مصروشام، دہلی، قومی پریس، ۱۳۱۹ھ

۳۷۔ نعمانی، علامہ شبلیؒ، مقالاتِ شبلی، اعظم گڈھ، مطبع معارف، ۱۳۷۸ھ/۱۹۵۵ء۔

۳۸۔ نعمانی، علامہ شبلیؒ وندوی، سیّد سلیمان، سیرۃ النبی ﷺ، لاہور، الفیصل ناشران اردو بازار ۱۹۹۱ء۔

(ج) انگریزی کتب

1. Adams, Charles C., Islam and Modernism in Egypt, London Oxford Uuniversity press, 1933.
2. Arnold , T. W., The Preaching of Islam, Delhi, 1990.
3. Asad, Muhammad, Islam at the Crossroads, Delhi, Noor Publishing House, Faras Khanah, 1992.
4. Asad, Muhammad, The Road to Mekkah, Delhi, Adam Publishers, 1992.
5. Fisher, Sydney Nettleton, The Middle East: (A History), London, Routledge & Keygon Paul,LTD., 1966.
6. Gibb, H. A. R., Arabic Literature London, Oxford University Press, 1926.
7. Glubb, Lieutenant-genaral Sir John Bagot, War in the Desert, LOndon, Hodder and Stouhton.

8. Haywood, John A., Modern, Arabic Literature, (1800-1970), London, Lund Humphries. 1965.
9. Iqbal,Sir Muhammad, The Reconstruction of Religious Thought in Islam, Delhi, Kitab Bhawan, 1974.
10. Jacques Berque, Egypt, Imperialism & revelution, London, Faber and Faber, 1972.
11. Jameela Maryam, Islam Versus The West, Delhi, Markazi Maktaba Islami, 1981.
12. Jayyusi, Salma Khadra, Trends and Movemnets in Modern Arabic poetry, Leiden, E. J. Brill, 1977.
13. Khouri, Mounah A., Poetry and the Making of Modern Egypt (1882-1922), Leiden, E. J. Brill, 1971.
14. Latif, L. A., Speeches, writings and statements of Iqbal, Lahore, Iqbal Academy Pakistan, 1978.
15. Lowell, Thomas, With LAwrence in Arabia, London , Hochinson co.
16. Lane-Pool, Stanly, The Muslims in Spain, New Delhi, Goodword Books, Pvt. Nizamuddin West Market, 2006.
17. Mahdi Ismat, Modern Arabic Literature(1900-1967), Hyderabad (INDIA), Da'iratul Ma-arif, 1983.
18. Nakasteen, M., A History of Islamic origin of Western Education: (800-1350 A.D)
19. Nicholson, R. A., A Literary History of the Arabs, Delhi, Adam Publishers, 1994.
20. Said, Edward W., Orientalism, England Penguin Books, 1995.

21. "Sykes-Picot Agreement" The Oxford Dictionary of 20th Century: (1914-1990), Peter Tecd, Newyork, Oxford University Press, 1992.
22. Shahin, Emad Eldin,Through Muslim Eyes: M. Rashid Rida aqnd The West, Herndon, Virginia, International Institute of Islamic Thought, 1415-1994.
23. Southern, R. A. Western views of Islam in the Middle Ages, Cambridge, Harvard University Press, 1962.
24. Watt, W.Montgomery, A History of Islamic Spain Edinburg, University Press, 1965.

☆☆☆☆

Iqbal Institute of Culture & Philosophy
University of Kashmir, Srinagar